سلسلۂ مطبوعات ادارۂ ادبیاتِ اردو شمارہ (۱۴)

نذرِ ولی

یعنی

بابائے ریختہ حضرتِ ولی اورنگ آبادی
کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ

از

طالبات جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد دکن

سنہ ۱۹۳[illegible]ء

مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد

ادارۂ ادبیات اردو

کی

دوسری مطبوعات

۱۔ **مرقع سخن جلد اوّل** دکن کے پچیس شعرائے دور آصفیہ کا با تصویر تذکرہ۔ صفحات ۴۲، تصاویر ۵، قیمت مجلد صمہ

۲۔ **مرقع سخن جلد دوّم** دکن کے دوسرے پچاس شعرائے دور آصفیہ کا با تصویر تذکرہ۔ صفحات ۴۰، تصاویر ۵، قیمت مجلد صمہ

۳۔ **سراج سخن** ——— انتخاب کلام شاہ سراج اورنگ آبادی۔ مرتبہ پروفیسر عبدالقادر صاحب سروری صفحات ۱۵۲ قیمت ۱۲/

۴۔ **ایمان سخن** ——— انتخاب کلام شیر محمد خاں ایمان۔ مرتبہ مولوی سید محمد صاحب ایم، اے صفحات ۱۲۰ قیمت ۱۲/

۵۔ **فیض سخن** ——— انتخاب کلام میر شمس الدین محمد فیض۔ مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲/

۶۔ **بادہ سخن** ——— انتخاب کلام ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ " " " صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲/

۷۔ **کیف سخن** ——— " " سیّد رضی الدین حسن کیفی " " " صفحات ۱۲۲ قیمت ۱۲/

۸۔ **متاع سخن** ——— " " نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز " " " صفحات ۱۲۵ قیمت ۱۲/

۹۔ **ورڈز ورتھ اور اسکی شاعری** ۔ از مولوی میر حسن صاحب ایم، اے۔ معہ تصویر صفحات ۱۸۴ قیمت

۱۰۔ **ٹیگور اور اس کی شاعری** ۔ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ایم اے۔ معہ تصویر صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

۱۱۔ **ہوش کے ناخن** (ڈرامہ) از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان صفحات ۹۶ قیمت ۱۲/

۱۲۔ **یوسف ہندی قید فرنگ میں** ۔ واقعات قید غالب از مولوی محسن بن شبیر صاحب بی اے، ال ال بی صفحات ۸۰ قیمت ۸/

فہرست

صفحات

تقریب

گذشتہ سال جب کلیۂ بلدۂ حیدرآباد کی طرف سے اس کے صدر مولوی سید محمد اعظم صاحب کی تحریک پر اردو کے مشہور شاعر ولی اورنگ آبادی کا ڈھائی صد سالہ جشن یادگار منایا گیا اور عالی جناب نواب سالار جنگ بہادر بالقابہ کی سرپرستی میں اس جشن کے ساتھ سیکڑوں اردو مخطوطات اور شعرا و قدردانان اردو کی تصویروں کی عالی شان نمائش منعقد کی گئی تو یہ خیال تک نہ تھا کہ اس تقریب سعید کا اتنا ہمہ گیر اثر ہوگا کہ اس کے ساتھ ہی بمبئی میں بھی یوم ولی منایا جائے گا اور اس کے بعد ہی مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کا قیام عمل میں آئے گا۔ نیز تمام ملک میں قدیم شاعروں اور خدمت گذاران اردو کے کارناموں کے مطالعہ اور ان کو منظر عام پر لانے کے شوق کے علاوہ دوسرے شاعروں کے یادگاری جلسے منانے کا خیال بھی پیدا ہوگا۔ چنانچہ آج کل مسلم کلچر سوسائٹی کی طرف سے یوم اقبال کے انعقاد کی کوشش کی جا رہی ہے، اور نہ معلوم جشن یادگار ولی نے ابھی اور کن کن امور کی طرف اہل ذوق کو متوجہ کر دیا ہے

جو اوپر سویر ظہور پذیر ہوتے رہیں گے۔
ادارۂ ادبیات اردو نے بھی اسی تقریب سے متاثر ہوکر بابائے ریختہ حضرت ولی اورنگ آبادی کی خدمت میں ایک نذرِ عقیدت پیش کرنے کا تہیہ کیا جو اِس وقت "نذر ولی" کی شکل میں زیر نظر ہے۔ اس سے قبل اس اِدارہ کی طرف سے جامعہ عثمانیہ کے بیسیوں طلبہ اور فیض یافتہ اصحاب کے مضامین کے مجموعے اور کتابیں شایع ہو چکی ہیں اور اب اِس جامعہ کی جماعت ایم، اے کی طالبات کے مضامین کا یہ پہلا مجموعہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اس میں حضرت ولی کی شاعری کے مختلف پہلوؤں پر چار مبسوط تنقیدی مضمون شامل ہیں جو کافی توجہ اور ذوق کا نتیجہ ہیں۔ ولی کی شاعری کا ایسا تفصیلی تجزیہ اب تک نہیں کیا گیا تھا۔ اِس کتاب کے مطالعہ سے یہ واضح ہو جائے گا کہ ولی واقعی استاد الاساتذہ اور آدم اردو تھے۔ ان کے کلام کی بعض خصوصیات ایسی ہیں جو اب پھر اردو شاعری میں جگہ حاصل کر رہی ہیں اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے اس نازک دور میں فارسی کے مقابلہ میں اردو کو بچا لینے کی جو سعی بلیغ کی تھی وہ کتنی مستحکم بنیادوں پر مبنی تھی۔ کیونکہ آج ہندی کے مقابلہ میں اردو کو بچانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جا رہی ہیں اور زبان کی اصلاح کی طرف جو توجہ ہے وہ انہی اصولوں پر مشتمل ہے جن پر ولی نے عمل کیا تھا۔
ولی نے اردو کو تمام ہندوستان میں عام فہم بنانے کی خاطر اس کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کیا۔ دکنی عنصر کم کر کے اس میں شمال کے روزمرہ کو بھی شامل کر لیا۔ اور اس کے علاوہ ایسے ہندی الفاظ رائج کر دئے جو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ

زبان کے لئے ضروری تھے۔

ان مضامین میں ولی کی معلومات، اُن کے تخیل، اُن کے فن شعر اور ذوق عرفان کے علاوہ ان کے اسلوب، زبان اور انتخابِ الفاظ کے متعلق بھی نہایت مفید اور دلچسپ بحثیں کی گئی ہیں۔ اردو ادب اور شاعری کا ذوق رکھنے والے اصحاب ان کے مطالعہ سے ضرور بہرہ مند ہوں گے۔

رفعت منزل خیریت آباد
۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء

سید محی الدین قادری زور

ولی کا تخیّل

از

لطیف النّساء بیگم
بی اے (عثمانیہ)

ولی کا تخیل

پڑھتے ہیں تیرے شعر کو آ کے عرش پہ قدسی

باہر ہے تیری فکرِ رسا حدِّ بشر سوں

تخیل ایک ذہنی عمل کا نام ہے۔ اگرچہ عام طور پر خیال آفرینی کو تخیل کہتے ہیں لیکن درحقیقت یہ ایک ایسا وسیع موضوع ہے جس میں قلبِ شاعر کے تمام جذبات و تاثرات اور ذہنِ شاعر کے تمام کیفیات و محرکات زیرِ بحث آجاتے ہیں۔ خیال کی نہ صرف پرواز اور ندرت ہی کا نام تخیل ہے بلکہ اس کا خیال جس جس رنگ میں رونما ہو اور جہاں جہاں پہونچے سب تخیل ہی تخیل ہے۔ چاہے فکر کی بلند پروازیاں آسمانوں کی خبر لائیں اور شعر کی بلند آہنگیاں بقول ولی قدسیوں تک پہونچیں لیکن خیال کی یہ ساری وسعتیں تخیل کے حدود سے نہیں بڑھ سکتیں۔ چنانچہ جب ہم اسی لحاظ سے اردو شاعری کی دنیا کے باوا آدم ولی کے تخیل کا تنقیدی جائزہ لیتے ہیں تو اس کے خیال کی بلند پروازیاں، وجدان کی سحر آفریں ترانہ سنجیاں، مضامین کی گوناگوں رنگینیاں، اور تصور کی حیران کن جولانیاں دیکھ کر تخیلِ عقل و خرد بھی دنگ رہ جاتا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ زبانِ اردو کے اس قدیم شاعر نے آج سے دو سو سال قبل ایسا اندازِ کلام اور اسلوبِ بیان کہاں سے سیکھا جو اربابِ ذوقِ سلیم کے لئے آج تک وجد آفریں ہے ؎

ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص   ہر اک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

اگرچہ ولی سے قبل بھی اردو شعراء گذرے ہیں اور ریختہ گوئی کا رواج اس سے بہت پہلے ہو چکا تھا سعدی، ذکی، حامد، یا امید کے بے رنگ طومار کا ولی کے ریختہ اور لطیف کلام سے مقابلہ کرنا سورج کو دیا دکھانا ہے اگرچہ شاہان قطب شاہیہ اور ان کے درباری شعرا کے دواوین بھی دکن کے وہ انمول خزانے ہیں جن پر ملک کو ہمیشہ ناز و امتیاز حاصل رہے گا لیکن افسوس ہے کہ وہ اب تک شایع ہو کر منظرِ عام پر نہ آسکے۔ اور بحالت موجودہ حاتم کا یہی شعر دہرانا پڑتا ہے ؎

حاتم یہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں لیکن ولی ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

ولی نے اپنی ندرت تخیل اور تیزیٔ طبع سے گلزار سخن میں ایسے ایسے دلفریب اور حسین گل بوٹے کھلائے کہ چمن زار سخن کو حسن زار لطافت بنا کے چھوڑا۔ فارسی کی طرح ہر صنفِ سخن میں کلام موزوں کیا۔ ردیف وار غزلیں، مخمس، ترجیع بند، مثنوی، قصائد، قطعات، رباعیات اور فردیات کہہ کر اپنے دیوان کو گلہائے رنگا رنگ سے پھول بن بنا دیا۔ اختراع و ایجاد سے نئے نئے انداز پیدا کئے۔ کلام کو نئی نئی صنعتوں سے مرصع کیا۔ رنگین خیالات اچھوتے مضامین، لطیف تشبیہیں اور انوکھے استعاروں سے ایک نئی دنیائے رنگ و بو بنائی اور مطالب و مقاصد کو ایسی پیاری پیاری اور جادو بھری اداؤں سے ادا کیا کہ حساس دل آج تک مزے لیتے اور اس خدائے سخن کو سراہتے ہیں۔ یہی وہ زورِ تخیل اور قوت فکر تھی جس نے آزاد سے "آب حیات" میں کہلوا دیا۔

"اس عہد کی بھاشا زبان کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحب کمال زبان اردو اور انشاء بندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا۔ اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔"

اس صاحب کمال کو بھی اپنے کمال کا احساس تھا فرماتے ہیں ؎

بانگ بلند بات یو کہتا ہوں اے ولی / اِس شعر پر سجا ہے اگر مجھ کو ناز ہو

اگرچہ فخر و تعلّی شاعروں کی میراث ہے لیکن ولی کا یہہ دعوےٰ

ولی تجھ شعر کوں سن کر ہوئے ہیں مست اہلِ دل / اثر ہے شعر میں تیرے شراب پرتگالی کا

یا

اے ولی مجھ سخن کو وہ پہونچے / جس کو حق نے دیا ہے فکر رسا

یا

ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو / رکھتے نہیں نظیر ایس کے سخن کی ہم

شاعرانہ فخر و تعلّی نہیں بالکل حقیقت اور واقعہ نگاری ہے۔ ولی کا کلام محشرستانِ سخن بن کر دنیائے ادب پر رونما ہوا زورِ کلام کے اس رنگ نے سب کے رنگ پھیکے کر دئے۔ زور کی تعریف مولانا حالی نے اس طرح کی ہے کہ جذبات الفاظ ڈھالتے جائیں نہ کہ الفاظ جذبات کو تلاش کرتے پھریں۔ شاعری وجدان کی زبان ہے اور اس کا کمال یہہ ہے کہ پڑھنے والے کا تصور شاعر کے تخیل کے ساتھ دنیائے خیال میں اڑتا پھرے اور جب تک وہ اِس دنیا میں ہے اپنی حقیقت کو بھول جائے کہ اس کو پر نہیں ہیں۔ یہہ صفت ولی میں بحدِّ کمال موجود ہے اور پھر ایسا شراب پُرتگالی کو دو آتشہ اور سہ آتشہ بنانے کے لئے جتنی آگ کی ضرورت ہے وہ بھی بدرجۂ اتم موجود ہے۔ سوز و گداز جذب و کشش، وارداتِ قلبی، جراحتِ طلبی، جذباتِ عشق اور تاثراتِ حسن سب ہی تو موجود ہیں۔ ان ہی خصوصیات نے اسکے کلام کی شمالی ہندوستان میں بھی شہرت کر دی۔ لوگ اس کے اشعار بطور تحفہ لے جانے لگے۔

ولی تجھ طبع کے گلشن میں جو کوئی سیر کرتے ہیں / وہ تحفہ لے کے جاتے ہیں تری گفتار ہر جانب

کبھی اس نے فنِ شعر میں نئی نئی طرحیں ایجاد کیں اور اپنے موجد ہونے کا یوں دعویٰ کیا۔

اس شعر کی یو طرح نکالا ہے جب ولی یہ اختراع سن کے رہے دل میں سب عجب

اور کبھی اچھوتے مضامین باندھ کر اپنے کمال پر جھوم کر کہا ؎

عجب نہیں جو حقیقت پہ آفریں بولے ولی جو کوئی سنے اس وضع کی یو تصنیف

ہر بڑے شاعر نے اپنے کمال کا دعوےٰ کیا ہے۔ انیس نے ڈنکے کی چوٹ فرمایا ؎

کسی نے تری طرح اے انیس عروس سخن کو سنوارا نہیں

یا

مری قدر کر اے زمین سخن تجھے بات میں آسماں کر دیا

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر مگر میں نے پلہ گراں کر دیا

میر نے اپنے دل آویز رنگ میں یوں دعوئے سخن کیا ہے ؎

ریختہ رتبہ کو پہونچایا ہوا ہے اس کا معتقد کون نہیں میر کی استادی کا

غالب نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں "استادی" دکھائی ؎

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ولی نے دعوئے سخن کرتے ہوئے بھی اپنی فقیر منشی نہ چھوڑی اور خاکسارانہ انداز سے کہا ؎

امید مجھ کو یوں ہے ولی کیا عجب اگر اس ریختہ کو سن کے ہو معنی نگار بند

صاحبان ذوق سلیم جانتے ہیں کہ اِس انکسار نے شاعر کے وقار اور عظمت کو کتنا بڑھا دیا اور اس "امید" اور "کیا عجب اگر" میں کتنی دل کشی ہے۔

ہر انسان کی فطرتی خواہش ہوتی ہے کہ اس کے ہم عصر اس کے کمال کی داد دیں۔ چنانچہ یہ خواہش ولی میں بھی

پیدا ہوئی، لیکن اس کو اس کے کمال کا جانچنے اور داد دینے والا خود اس کے وطن میں نہ مل سکا سخن دانوں اور سخن فہموں کا یہی وہ فقدان تھا جس نے بار بار اس کی زبان سے کہلوایا ؎

ولی تیرے سخن یاقوت سے رنگیں ہوئے لیکن ! خریداران جہاں جنبہ کہاں ہیں آج جوہر کے

یا

ولی رکھتا ہوں سینے میں ہزاروں گوہر معنی دکھاؤں اپنے جوہر کوں اگر کوئی جوہری آوے

اور یقیناً "جوہری" کے اسی شوقِ جستجو نے اسے وطن سے نکالا اور ولیؔ پہونچا یا۔ وہاں اس کی مردم شناس نظر وں نے سخن دانوں کو ڈھونڈ نکالا اور اس نے ان کے آگے اپنے انمول جواہر ع "قدر جوہر شاہ داند یا بداند جوہری" کہتے ہوئے رکھ دئیے۔ جب اس متاعِ بے بہا پر وہاں کے صاحبانِ کمال کی نظریں پڑیں اور انھوں نے اردو کو اس رنگ میں دیکھا تو دنگ رہ گئے۔ انھیں اس کا سان و گمان بھی نہ تھا کہ وہ زبان جس کو انھوں نے سرے سے استعمال کے قابل ہی نہ سمجھا تھا ادبی زبان کی حیثیت بھی حاصل کر سکتی ہے ع "بہ بیں تفاوت رہ از کجا است تا بہ کجا" یا تو وہی زبان منہ لگانے کے قابل بھی نہ سمجھی جاتی تھی یا اس کی دلکشی پر سب لٹو ہو گئے۔ گھر گھر دیوان ولیؔ کے چرچے ہونے لگے۔[1] "اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔ قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت کی زبان سے پڑھا گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں اُن ہی کی غزلیں گانے لگے۔" سب نے تقلید شروع کی۔ ہوتے ہوتے مضامین بھی چرائے جانے لگے۔ منہ پھٹ شاعر کو تاب کہاں بگڑ کر کہا ؎

سخن شناس کے نزدیک کب ہے کم زبزید کسی کے مطلبِ رنگین کوں جو کرے ہے شہید

دوسرے شعرا سے نوک جھونک ہونے لگی ؎

تیرے سخن کے نغمۂ رنگین کوں سن ولیؔ ڈوبا عرق کے بیچ عراقی عراق میں

---

[1] ماخوذ از آبِ حیات

اچھل کر جا پڑے جیوں مصرعِ برق اگر مصرع لکھوں ناصر علی کوں

ہم عصر نے بھی ذو معنی جواب دیا ؎

بہ اعجازِ سخن گر اڑ چلے وہ ولی ہرگز نہ پہونچے گا علی کوں

کبھی فراقی پر آوازہ کسا گیا ؎

ترے اشعار ایسے نئیں فراقی! کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

پھر اس چوٹ کے دکھ کو کم کرنے کے لئے اس کے مصرع پر گرہ بھی لگائی ؎

ولی مصرع فراقی کا پڑھوں تب جب کہ وہ ظالم کمر سوں کھینچتا خنجر چڑھاتا آستیں آوے

غرض اس کے اپنے چیدہ حالات کے علاوہ اس کے کلام سے دکن کے اس دور کی خصوصیات اور مذاق کا پتہ بھی چلتا ہے اس کا کلام اپنے دور کے تمدن اور معاشرت کا آئینہ ہے اور یہی ولی کے کمالِ فن کا راز ہے۔ شاعر جتنا اپنے دور سے ملا رہے گا اتنا ہی کامیاب رہے گا۔ اس کا تخیل نہ صرف ہندی بلکہ دکنی ہے وہی تصوف کا رنگ جو اس زمانے کی خصوصیت تھا۔ وہی مجاز کے پردے میں حقیقت کی باتیں، وہی عشقِ مجازی کے ذریعے جستجوئے عشقِ حقیقی، وہی حسن و عشق اور گل و بلبل کے افسانوں میں معنی نگاری۔ اور وہی دکنی لب و لہجہ جو اس دکنی دور کا امتیاز تھا اس کے کلام کی جان ہے۔ وہ ایک غزل گو شاعر ہے اس کی دنیائے تخیل غزلیت اور موسیقیت سے لبریز ہے کہتے ہیں کہ فکر کی بلند پروازی غزل گو شعرا کے کلام میں کم پائی جاتی ہے۔ صرف نازک خیالات اور اچھوتے مضامین کی گنجائش نکل سکتی ہے لیکن ولی نے اپنی غزلوں ہی میں پروازِ خیال اور لطافتِ تخیل کے دریا بہائے ہیں معاملہ بندی، واقعہ نگاری، مضمون آفرینی اور بلند پروازی کے جیسے انبار ولی نے اپنی غزلوں میں لگائے ہیں وہ آج تک بازارِ سخن میں کم پائے جاتے ہیں۔ ایشیائی شاعری اور خصوصاً اردو تغزل پر مغربی ادب پرستوں کا

ایک عام اعتراض یہہ ہے کہ اس کی شاعرانہ رنگینیاں مصنوعی اور اس کی سحر کاریاں جھوٹی ہوتی ہیں۔ نہ اس کو حقیقت نگاری سے کوئی لگاؤ ہوتا ہے نہ واقعہ نگاری سے کوئی سروکار۔ بظاہر یہہ اعتراض بہت درست ہے، اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ انگریزی نظم کی وہ صنف جس کو لیرک (Lyric) کہتے ہیں اپنے اندر ایسے گوناگوں تنوعات رکھتی ہے جو اردو تغزل میں موجود نہیں۔ مشرقی اور مغربی شاعری کے رجحانات اور ان کے افکار و تخیل کی خصوصیات اور ان کے ارتقا کے اسباب پر غور کرنے کے بعد اس اعتراض کی اہمیت جو بادی النظر میں وقیع نظر آتا ہے بہت کچھ گھٹ جاتی ہے۔

مغربی اور مشرقی شاعری میں بعد المشرقین ہے۔ مشرقی شاعری کی خصوصیت موضوعی[1] اور باطنی کیفیات پر مبنی ہے۔ اس کی دنیا زیادہ تر موضوعی ہوتی ہے وہ اپنے باطن کے عالم رنگ و بو کی دلچسپیوں میں کچھ ایسا غرق ہوتا ہے کہ دنیائے واقعیت[2] سے دور جا پڑتا ہے۔ حقیقت میں اس کی موضوعیت[3] کی یہی نزاکت اور اس کے تخیل کی پرواز ہی اس کا کمال شاعری ہے۔ مشرقی شاعر تصوریت[4] پسند ہوتا ہے اس لئے عام طور پر مشرقی شاعری میں موضوعیت کا عنصر غالب رہتا ہے۔ برخلاف اس کے مغربی فن کاری کی خصوصیت یہہ ہے کہ شاعر ایک معروضی[5] عالم میں رہتا ہے۔ اس کو خارجی عالم سے ایک خاص ربط رہتا ہے۔ وہ مشرقی شاعر کی طرح اپنے باطنی عالم سے متاثر نہیں ہوتا۔ بلکہ خارجی عالم ہی اس پر اثر انداز رہتا ہے اور یہی خصوصیت مغربی اہل فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ مغربی شاعر واقعیت[6] پسند ہوتا ہے، ان راست اثرات کو جو وہ اپنے اردگرد کی دنیا سے لیتا ہے خوبی سے ظاہر کرنا مغربی شاعری کا کمال فن کاری ہے، یہی وجہہ ہے کہ مغربی شاعری میں معروضیت[7] کا عنصر نمایاں رہتا ہے۔

پس جب ہر دو ارباب فن کے موضوع ہی الگ ہیں۔ رجحانات اور محرکات ہی مختلف ہیں اور دونوں کا

---

[1] Subjective [2] Realism [3] Subjectivity [4] Idealist

[5] Objective [6] Realist [7] Objectivity

مطمحِ نظر بھی جدا جدا ہے تو چاہیے کہ دونوں کے کمال کو پرکھنے کی کسوٹیاں بھی جدا جدا ہوں ورنہ اگر ایک فن کے معیارِ کمال پر دوسرے کو جانچا جائے تو یقینی بات کہ اسکی حسن و خصوصیات کا اندازہ ہرگز نہ ہوسکے گا اور اس طرح ایک کے معیار پر دوسرے فن کو پرکھنا اور اسکے کمال کی نزاکتوں کو پامال کرتے ہوئے اس کے حسن و قبح کی نسبت غلط حکم لگانا کسی صاحبِ فہم کے پاس قرینِ انصاف نہیں ہوسکتا۔

اپنے اس خیال کی تائید میں ہم مغربی اور مشرقی مصوری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ مغربی مصوری کے دو بڑے اصناف منظر نگاری[1] اور تصویر کشی[2] ہیں۔ ان ہر دو اصناف میں ایک مغربی مصور جس بات کا خاص التزام رکھتا ہے وہ واقعہ نگاری یا واقعیت[3] ہے۔ منظر نگاری میں خطوط اور رنگوں کے توازن کے ساتھ سب سے بڑا التزام اس بات کا رکھا جاتا ہے کہ واقعیت ہاتھ سے جانے نہ پائے۔ اس خصوصیت میں جو چیز نمایاں ہوتی ہے وہ پیش کردہ منظر کے نظری[4] زاویوں کی صحت ہے۔ اور یہی چیز واقعیت کی جان ہے اسی طرح تصویر کشی میں بھی مغربی مصور کے پیشِ نظر انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت کی صحیح صحیح ترجمانی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مشرقی مصور منظری زاویوں کے قید و بند سے آزاد نظر آتا ہے۔ بظاہر اس کی مصوری اس قدر ناقص نظر آتی ہے کہ وہ مناظر کو صحیح زاویوں میں بھی نہیں بتا سکتا یا وہ مناظر و سراپا کے معمولی قواعد سے بھی ناآشنا ہے۔ اسی طرح مشرقی تصویر کشی[5] میں انفرادی خصوصیات، جذبات اور سیرت نگاری بھی مفقود نظر آتی ہے۔ مشرقی مصوری کی نزاکتوں سے ناواقف ہونے کی وجہ سے یا اس کے کمالِ فن کو سطحی نظر سے جانچ کر یہ کہہ دینا کہ مشرقی مصوری ناقص ہے درحقیقت خود نقاد کی بے بصری کی دلیل ہے حقیقت شناس جانتے ہیں کہ مشرقی فن کار کے لئے پابندیِ رسم و آئین

---

۱ Landscape ۲ Portrait Drawing ۳ Realism
۴ Perspective ۵ Portrait

ایسی ہی ضروری ہے جیسے مذہبی رسوم کی لیکن ظاہر بیں نظریں کیا جانیں کہ اس کے نزاکتِ خیال، معنی آفرینی اور موضوعی کیفیات میں کتنی گہرائیاں ہیں اور اس باکمال مصور نے ظاہری دنیا سے الگ رہ کر حسن و معنی کے کیسے کیسے دریا بہائے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اجنتہ کی مصوری، ایلورہ اور پالم پتھ کے مندروں کی نازک اور حسین بت تراشی کے موضوعی پہلو اور خیال آفرینی کو ایک عامیانہ نظر سے جانچنے والا محسوس نہیں کر سکتا۔

مشرقی اور مغربی شاعری کے معیار کی تخصیص کے بعد جب ہم ولی کو ان معیاروں پر پرکھتے ہیں جو ایک مشرقی شاعر کے خصوصیاتِ فن ہیں تو اس کے عیارِ شعر کو اتنا کھرا اور خالص پاتے ہیں کہ اس میں میل اور کھوٹ کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ولی کا تخیل کیا ہے ایک بحرِ ناپیدا کنار ہے کہ جس کے تنوعات اور رنگا رنگیوں کا تعین حدِ امکان سے باہر ہے۔ اس کی شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس میں تصوریت بھی ہے اور واقعیت بھی۔ اس باکمال کے صہبائے سخن میں خصوصیاتِ مشرق و مغرب کچھ اس طرح گھل مل گئے ہیں کہ اس کا لطف کچھ نقاد کا دل ہی جانتا ہے۔ اس کی دنیائے تخیل وہی ہے جو ایک ابتدائی غزل گو شاعر کی ہونی چاہیے۔ وہی اندازِ تکلم وہی خیال آفرینی۔ ولی کا کلیات بھی غزل گو شعرا کے دواوین کی طرح حسنِ محبوب کی طویل داستانوں، گل و بلبل کے دلکش افسانوں اور سرو و شمشاد کی نہ ختم ہونے والی کہانیوں سے بھرا پڑا ہے، وہی بے بنیاد تشبیہیں وہی مشرقی تعریفیں اس کے کلام کا امتیاز ہیں مشتے نمونہ از خروارے یہ ہیں۔

سورج اُس کے حسن کی ایک چنگاری ہے۔

تیرے خالِ زیبا کو دیکھ کر چاند کے سینے پر داغ پڑ گیا۔

آفتاب تیرے حسن کو دیکھ کر رشک کے مارے جلتا ہے۔

تیری کمانِ ابرو کی موزونیت دیکھ کر آسمان نے قوسِ قزح کی طرح ڈالی۔

ہلال نے تیرے ابروؤں کی تعریف کرتے کرتے بدر کا مرتبہ پایا۔
دریا اس کے حسن کے آگے مارے شرم کے پانی پانی ہوگیا۔
حباب اس کی زیارت کے لئے سراپا چشم ہے۔
نرگس نے اس کی غزالی آنکھوں کو دیکھ کر شدت تعجب میں پلک جھپکنا فراموش کردیا
اس کے شیریں لبوں کے آگے شہد وشکر مات ہیں۔
مصری میں وہ شیرینی کہاں جو اس کے کلام میں ہے۔
اس کے سرو جیسے قد نے طوبےٰ کا درجہ بڑھایا۔
گلاب اس کے رخسار کی آب وتاب کے آگے آب آب ہوگیا۔
اس کی شیریں سخنی نے بلبلوں کو نواسنجی سکھائی۔
اس کے انداز رفتار سے آسمان نے تحمل کا سبق لیا وغیرہ وغیرہ۔

یہی ہے اس کی تصوریت کا عنصر جو اپنے پورے آب وتاب کے ساتھ جلوہ گر ہے۔

اب واقعیت کے عنصر کو دیکھئے۔ شاعر چونکہ مئے عرفان سے متوالا ہے۔ قدرت کی ہر حسین صنعت سے پیار کرنا اسکا ایمان ہے چنانچہ وہ حسنِ انسانی کے ہر دلفریب نمونے میں ایک خاص کشش پاتا ہے چاہے اسے آپ انس کہئے یا محبت۔ لیکن وہ ایک ایسی پاک اور بے لوث محبت ہے جس میں میل اور کھوٹ کا شائبہ تک نہیں اور صرف "محبت" کا حظ اٹھانے اور حقیقی الفت کے تاثرات سے فیض یاب ہونے کے لئے ہے۔

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی یو بوجھ کے بلبل ہوں ہر اک غنچہ وہاں کا

لیکن دلی کا ایک خاص "ساجن" بھی ہے جس کو وہ پیار سے صدہا ناموں سے پکارتا ہے کبھی "پیتم پیارے" کہتا ہے

کبھی "سری جن" کبھی "لالن" کہہ کر پکارتا ہے تو کبھی "من موہن"، کبھی "محشر ناز و ادا" کا خطاب دیتا ہے تو کبھی "فتنۂ رنگین ادا" کا اس طرزِ تخاطب کی موسیقیت اور حسین الفاظ کا انتخاب جن سے وہ اپنے محبوب کو مخاطب کرتا ہے اس کی والہانہ محبت اور وارفتگیٔ عشق کا پتہ دیتا ہے۔ اس کی صداقت محبت میں تو کچھ کلام ہی نہیں لیکن عقل کہتی ہے کہ اس مبالغۂ حسن میں بھی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہے۔ اگر ولی کا محبوب درحقیقت ایسا ہی حسین ہے کہ اس کے چہرۂ زیبا کے آگے چاند سورج شرماتے ہیں تو بھی ولی کا بیان حقیقت پر مبنی ہے اور اگر اس کا ساجن بہ سبب شدت محبت کے اس کو اتنا خوبصورت نظر آتا ہے تب بھی اس کی تعریف حقیقت کا پہلو لئے ہوئے ہے۔

علاوہ بریں ولی کا ساجن اردو شاعری کا خیالی محبوب نہیں جس کے اوصاف میں سے بقول مولانا حالی کسی ایک صفت سے بھی کسی شائستہ اور خود دار انسان کو متصف کر دیا جائے تو اس کو حق حاصل ہو جائے گا کہ عدالت میں ہتکِ عزت کا دعوےٰ کر دے۔ برخلاف اِس کے ولی کا "من موہن" شریف، خود دار، پاک نفس اور با حیا ہے اس کے وقار سے شمشاد نے تمکنت سیکھی، ماہتاب نے متانت کا سبق لیا اس کی صحبت میں پھولوں نے شگفتہ روئی اور غنچوں نے کم سخنی اختیار کی۔ سورج نے فیض رسانی کی عادت ڈالی۔ عندلیب شیریں زباں بنے گل اس کو دیکھ کر شرم سے (گلاب) پانی پانی ہو گیا۔ اور نرگس اپنی بے حیائی پر شرمانے لگی۔

وہ بلند قامت ہے۔ سبز رنگ ہے۔ اس کا بدن سڈول ہے۔ اس کے اعضا سانچے میں ڈھلے ہیں۔ جٹی کمان دار ابرو اور سیاہ بڑی بڑی "نشیلی" آنکھیں ہیں، لب "یاقوت رنگ" ہیں لب اور ابرو پر خال بھی ہیں۔ جو اس کے حسن میں چار چاند لگاتے ہیں۔ وہ شیریں گفتار بھی ہے اور متانہ رفتار بھی

وہ عالم ہے۔ "زباں داں" ہے۔ "سخن آشنا" ہے۔ جوہر شناس ہے۔ شرمیلا ہے۔ دوست کے گھر یوں آتا ہے "جوں سینے میں راز آئے"، لیکن کسی قدر بے نیاز بھی ہے اور بقول عشاق "محبت الّا بے نیازی سب کچھ

برداشت کر سکتی ہے۔ اس کی یہ بے نیازی ولی کے لئے سخت تکلیف دہ بلکہ ناقابلِ برداشت ہے۔ لیکن اس کا علم اور سخن دانی باعثِ طمانیت ہے۔ بلا کا باریک بیں ہے اور اس کی "سخن فہمی ادا سنجی بلا ہے"۔ وہ شوقین اور رنگین مزاج ہے اس کو جگمگاتے بھڑکیلے ملبوس پسند ہیں۔ زریں لباس میں اس کا چہرہ سورج کی طرح دمکتا ہے۔ قیامت کا جامہ زیب ہے "اس آتشیں رخسار پر" ہر لباس کھب جاتا ہے۔ اس کا محب کبھی اس کے لباس کو سورج کی شعاعوں سے اور کبھی آگ کے شعلوں سے تشبیہ دیتا ہے، اور لباس کی مناسبت سے کبھی اپنے محبوب کو "چشمۂ خورشید" کہتا ہے اور کبھی دریائے نور، وہ اکثر گلابی یا صندلی قبا میں نظر آتا ہے۔ سر پر دستار یا پٹیھا باندھتا ہے جس کے کنارے زریں ہوتے ہیں اس کی قبا نیچی ہوتی ہے جس کے دامن اکثر زرکار ہوتے ہیں۔ ولی کا یہ خاص "بنیتم پیارا" ہر وقت، ہر بار، ہر موقع پر اپنے خاص قد و قامت، خاص چہرے مہرے، مخصوص سج دھج، مخصوص لباس، اسی متین انداز اور اسی اپنی " لٹک بھری " چال سے اس کے منظر شاعری پر رونما ہوتا ہے۔

یہی وہ قابلِ قدر ذات ہے جو اس کے کلام کے دو پہلو تصوریت اور واقعیت کا سنگم ہے۔ یہ ایک ایسی خصوصیت ہے جس نے ولی کو ایک ایسی نرالی شان بخشی جو نہ ولی سے قبل کسی شاعر نے پائی نہ اس کے بعد کسی اور کو نصیب ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اس تصوریت اور واقعیت کے میل نے ولی کے تخیل کی دنیا بنائی جس میں محبت کی سحر آفرینیاں، وجدان کی گوناگوں رنگینیاں، تصور کی فلک پیمائیاں اور جذب و شوق کی طوفان برپا جولانیاں ایک قیامت برپا کئے ہوئے ہیں۔

ولی کی شاعری میں جو خاص توازن نظر آتا ہے اس کی وجہ اس کا عشقِ حقیقی اور عشقِ مجازی ہے۔ چونکہ اس کے جذبات حقیقی اور تاثرات سچے تھے اس کی سادہ سے سادہ غزل بھی اپنے اندر ایک محشر سوز و گداز رکھتی ہے۔

ولی نے اپنے متقدمین کے راستے سے ہٹ کر جن کے ہاں صرف معدودے چند اصناف سخن پائے جاتے ہیں اپنا ایک الگ ڈگر قائم کیا اور فارسی شعرا کی طرح ہر صنف سخن میں شعر کہہ کر اپنے دیوان کو باقاعدہ مرتب کیا۔ اس نے اپنی ہی غزلوں پر مستزاد اور مخمسات کہے ہیں۔ جس کی وجہ شاید ایک یہ ہو کہ جدت طرازی اس کی فطرت میں تھی اور دوسری یہ کہ دوسرے شعرا اس کی آنکھوں میں جچتے نہ تھے۔ اس نے قصائد بھی لکھے ہیں اور ترجیع بند بھی۔ رباعیات میں بھی طبع آزمائی کی ہے اور قطعات میں بھی۔ لیکن ولی کا کمال شاعری دیکھنا ہو تو تغزل کو دیکھنا چاہیے۔ اس کے تغزل میں ایک کائناتِ رنگ و بو جلوہ آرا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ پہلے اس کے سارے اصنافِ سخن کو ایک نظر دیکھ جائیں اور پھر تغزل پر آئیں اور اس کے گوناگوں تاثرات و جذبات کا تفصیلی جائزہ لیں۔

اصنافِ سخن

مثنوی مثنوی شاعری کی ایک بہت مفید صنف ہے۔ چونکہ اس میں ردیف اور قافیہ کی جکڑ بندیاں کم ہیں ہر شعر ایک نئے قافیہ میں کہا جا سکتا ہے اور ہر شعر ایک نئے قافیہ میں کہا جا سکتا ہے اور ہر شعر کے بعد ردیف بدلی جا سکتی ہے۔ اس لئے شاعر کو اس صنف میں بہت سی سہولتیں حاصل رہتی ہیں۔ مولانا حالی فرماتے ہیں کہ مثنوی شاعری کی بہترین صنف ہے۔ شاعر اس سے بہت سے کام لے سکتا ہے وہ قصے، تاریخی حکایتیں، قومی روایات، مذہبی واقعات، مفید اصلاحیں اد خود اپنے جذبات و محرکات کی جیتی جاگتی تصویریں مثنوی کے ذریعے جس سلیس اور دلکش پیرائے میں ادا کر سکتا ہے اور کسی صنفِ سخن میں نہیں کر سکتا۔

ولی کے ہاں صرف دو مثنویاں ہیں اور وہ بھی مختصر سی اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح غزل اور تصوف دورِ انحطاط کی پیداوار ہیں اسی طرح مثنوی دورِ عروج و اطمینان کا پھل ہے چونکہ اردو کے اس باکمال شاعر نے ایک ایسی فضا میں آنکھ کھولی جب کہ دکنیوں کے سکون میں ہیجان و تموج برپا تھا۔ مغل بھاگ نگر کی اینٹ سے اینٹ بجانے پر تلے ہوئے تھے اور بھاگ نگری اپنے وطن کے لئے مر مٹنے پر۔ تمام سرزمین دکن مغلوں کی یورشوں سے تہ و بالا ہو گئی تھی۔ ہوش سنبھالا تو نقشہ ہی دگرگوں تھا الغرض اس دور بے اطمینانی کا خمیازہ ادب لطیف کو بھگتنا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ ولی کی مثنویاں بے رنگ ہیں۔ نہ ان میں پرواز خیال پائی جاتی ہے نہ معنی آفرینی ہاں سلاست زبان اور ندرت خیال قابل تعریف ہے۔ منظر نگاری بھی کہیں کہیں اچھی ہے۔

ملاحظہ ہو از مثنوی شہر سورت ــ

عجب شہراں میں ہے پر نور اک شہر بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر
اہے مشہور اس کا ناؤں سورت کہ جاوے اسکے دیکھے سب کدورت
جگت کی آنکھ کا گویا ہے یہہ نور اچھو اس نور سوں ہر چشم بد دور
شہر جیوں منتخب دیوان ہے سب ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب
سرج سن آب اس کی جگ میں کانپیا سمندر موجزن رگ رگ میں کانپیا
کنارے اس کے اِک دریائے تپتی کہ دنیا دیکھنے کوں اس کے ٹپتی
کھلے ہیں ہر طرف رخسار کے گل ہر اک گل کے نزِک واں پر ہے سنبل
کہاں ہے ساقیٔ اخلاص انگیز! محبت کی کرے مئے مجھ اوپر ریز
صفائی سوں کھلے مجھ جیو کا باغ کروں اس دُرد مئے کوں مرہم داغ
بھری ہے سیرت و صورت سوں سورت ہر اک صورت ہے واں انمول مورت

ولی کی دوسری مثنوی ایک مناجات ہے جو ممکن ہے ان کی کسی بڑی مثنوی کا ایک حصہ ہو اسکے چند شعر یہاں نمونہ کے طور پر پیش کئے جاتے ہیں۔

الٰہی! دل اُپر دے عشق کا داغ! یقیں کے نین میں سٹ کُحلِ مازاغ
الٰہی! عشق میں مشتاق کر مجھ اپس کے شوق کا مشتاق کر مجھ
عیاں کر دل اُپر رازِ طریقت سینے پر کھول ابوابِ حقیقت
پرکھنے معرفت کا جوہر صاف اپس کے فرض سوں کر دل کوں صراف

چمن میں شوق کے دل کھول جیوں گل | اسی گل کے اپر کر دل کوں بلبل
یہہ دل معمور کر جیوں شیشۂ مُل | پریشانی نہ دے مانندِ سنبل
محبت کی عطا کر مئے پرستی | اپس کی معرفت کی بخش مستی
جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ! | اپس کی یاد سوں آباد کر مجھ
برہ کے باغ میں دے آب داری | ہمیشہ رکھ جھڑی نیناں کی جاری

قصائد ولی کے کل قصائد چھ[۶] ہیں۔ پہلا قصیدہ لامیہ ہے جس میں حمد و نعمت اور منقبت و موعظت سبھی کچھ ہے۔ دوسرا[۲] قصیدہ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی شان میں ہے۔ تیسرا[۳] جناب امیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی منقبت میں۔ چوتھا[۴] در مدح بیت الحرام۔ پانچواں[۵] میراں محی الدین قدس سرہٗ اور چھٹا[۶] شاہ وجیہہ الدین اعلی اللہ مقامہٗ کی شان میں۔

قصیدہ زمانۂ امن و امان اور عہدِ شاہی کی پیداوار ہوتا ہے۔ دربار کی سرپرستی میں پھولتا پھلتا ہے اور شاہی آبیاری کی بدولت پروان چڑھتا ہے۔ چونکہ ولی کی شاعری نے ایک ایسے دور میں جنم لیا تھا جبکہ دکن کی منظّم سلطنتوں کا شیرازہ بکھر چکا تھا۔ دکن کا وہ زرّیں دور جو آسمانِ ادب پر ماہِ کامل بن کر نمودار ہوا اپنی ٹھنڈی اور نورانی شعاعوں سے دکن کو ایک پیکرِ نور بنا کر ختم ہو چکا تھا اور فضائے ادب پر تنزل و انحطاط کی بدلیاں چھائی ہوئی تھیں۔ ولی کے قصائد موافق موسم اور مناسب آب و ہوا سے محروم رہے۔ نہ شاہ پرستی کے جذبات محرک مضامین اعلےٰ تھے نہ شاہی قدردانی باعث ندرتِ خیال۔ یہی وجہہ ہے کہ ولی کا تخیل قصائد میں بہت سطحی نظر آتا ہے جس طرح بے موسم پیداوار بے مزہ ہوتی ہے ولی کی یہہ بے موقع قصیدہ خوانی بے رنگ سی ہے۔ اس نے ہر صنفِ سخن میں

طبع آزمائی کی ہے لہٰذا ضروری تھا کہ فارسی شعرا کی طرح قصائد میں بھی زورِ تخیل دکھایا جائے۔ چنانچہ کبھی حمد و نعت و منقبت کو اپنا موضوع قرار دیا اور کبھی بیت الحرام کو اپنا ممدوح بنایا۔

ولی کے قصائد میں تشبیب بھی ہے تغزل بھی ہے گریز بھی اور خاتمہ بھی۔ لیکن مجموعی طور پر رنگ پھیکا ہے اور وہ زورِ کلام نہیں جو قصیدے کی جان ہوتا ہے۔ بہترین قصیدہ سرورِ کائنات کی شان میں ہے جس کے چند اشعار ہدیۂ نظر ہیں۔

از قصیدۂ دوم در شان خاتم الانبیاء علیہ السّلام

عشق میں لازم ہے اول ذات کوں فانی کرے ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
مرتبہ خلت بنا ہی کا وہ پاویگا جو کوئی مثل اسمٰعیل اول جی کوں قربانی کرے
وہیچہ پاوے مطلب راضیۃً مرضیۃً محض للہ جگ میں جو اعمال پنہانی کرے
بوریائے بے ریا کوں تخت سی سمجھے اوحکن اس اپر ہو کر سلیماں شکر رحمانی کرے
یا محمد دو جہاں کی عید ہے تجھ ذات سوں خلق کوں لازم ہے جی کوں تجھ پہ قربانی کرے
رتبۂ عالی میں دیکھے حق نزیک اپنا کلام گر کلیم اللہ آ۔ تیری ثنا خوانی کرے
تب مسیحا فقر کے خط کوں سکھے گا تجھ نزیک مشق کرنے فقر کی جب لوح پیشانی کرے
جس مکاں میں ہے تمہاری فکر روشن جلوہ گر عقل اوّل آکے واں اقرار نادانی کرے
عارفاں بولینگے جان و دل سی لاکھوں آفریں جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

قصیدۂ لامیّہ ۔ فارسی میں قصیدۂ لامیہ کہنا قادر الکلامی کی دلیل سمجھی جاتی تھی۔

لیکن اردو میں قصیدۂ لامیہ کہنا مشکل نہیں اور پھر ولیؔ نے تو اپنے قصیدۂ لامیہ میں لبصل۔ دبول بکل وغیرہ قافیے بھی شریک کر لئے ہیں۔ خاصکر ہندی الفاظ کی وجہہ سے قافیہ کی سہولت تو ہوگئی لیکن بعض جگہ بعض الفاظ عہد حاضر کے ذوق کے لئے شاید بارگراں معلوم ہوں!

منتخب اشعار از قصیدۂ لامیہؔ ؎

لے زباں پر تو اوّل اوّل! نام پاک خدائے عزّ وجل
لائق حمد ہے اس بن اور اس او پر متفق ہیں اہلِ ملل
شکر اسکا محیط اعظم ہے وہ ہے سلطان بارگاہ ازل
بعد حمد خدائے بے ہمتا! یاد کر نعت سیّد مُرسل
اسکی مجلس بیں آہوا ہے کھڑا صف آخر میں جو ہر اوّل
بعد اس آفتاب انور کے چار ہیں اہل علم واہل عمل
صاحب صدق وعدل وعلم وحیا ایک سوں ایک اکمل وافضل
بعد ان کے ہیں دو امام جہاں نور چشم پیمبر مُرسل
ہر دو سلطان کشور کونین!! ہر دو مقبول شاہ روز ازل
گل دنیا کوں زیب تاج نکر یہ ہے سرپا تلک محیل ودغل
مرتبہ بوجھ عشق بازاں کا! یہ ہیں ملک وفا کے اہلِ دول

غزل

(جو قصیدہ میں شامل ہے)

اے ترے نین ہیں یہہ دو چنچل — دیکھنے جن کوں خلق آوے چل

اے ولی ترک کر یہہ حرف دراز — کہ رہے خیر الکلام قل و دل

مستزاد۔ مستزاد دو قسم کے ہوتے ہیں۔ اول تو یہہ کہ ہر مصرع پر ایک فقرہ بڑھا دیا جاتا ہے جس کا مفہوم اسی مصرع سے متعلق رہتا ہے۔ یا صرف دو رکن ہر مصرع پر لگا دئے جاتے ہیں جن کا مفہوم تو مصرع سے چسپاں رہتا ہے۔ لیکن دوسرے مصرع کی طرح تعلق کسی قدر مختلف بھی ہو سکتا ہے ولی کے تین مستزاد نمونتاً پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کا حسن معنوی اور سلاست بیان قابل تعریف ہے۔

(۱)

گئے رات معراج وہ عرش اپر — بلغ العلے بکمالہ!!

کھلے پردے سب بھید کے سربسر — کشف الدجے بجمالہ!!

ہوئی حق کی ان پر جو حب کی نظر — حسنت جمیع خصالہ!!

ہوا حکم حق کا محبّاں اوپر — صلّو علیہ و آلہ!!

شاعر نے اپنے پرترنم مصرعوں پر ان مشہور مصرعوں کو بجائے فقروں کے بڑھا کر مستزاد کا ایک اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔

(۲)

کینا ہے نظر جب ستی تجھ رشک پری پر — کھویا ہے چمن من

باندھا ہے جو کوئی جیو کوں تجھ عشوہ گری پر — پھرتا ہے وہ بن بن

دیکھے سوں ترے داغ کے جلوے کوں جگر پر — بولا مجھے یوں دل

کیا خوب اٹھا نقش عقیق جگری پر — خورشید سوں روشن

پہلے شعر کی لطافت اور نزاکت خیال اور دوسرے شعر میں ندرت مضمون قابل داد ہے۔

(۴) معلوم نہیں کن نے مرے دل کوں لیا ہے | ان عشوہ گراں میں
ظاہر میں ترو تازہ و باطن میں ترا داغ | رکھتا ہے جو دائم
جیوں لالہ اسے بوجھ کہ نیرنگ دیا ہے | خونیں جگراں میں
عاشق کوں ہے بے تابی و بے طاقتی دل | سرمایۂ بینش

بن عشق جو عالم میں فراغت سوں جیا ہے | ہے بے بصراں میں
تنہا نہیں سرشار ولی شوق سوں تیرے | اے ساقی بدست

تجھ عشق کا اس بزم میں جو جام پیا ہے | ہے بے خبراں میں

اشعار متذکرۂ بالا میں محبت و معرفت کے نکات جس خوبی۔ سادگی اور میٹھی زبان میں ادا کئے گئے ہیں وہ اپنی آپ نظیر ہیں

مخمسات ۔ ولی کے مخمسات میں اسکا تخیل پر تول کر اڑتا ہے اور آسمان سے تارے توڑ لاتا ہے بیان میں سلاست ۔ زبان میں گھلاوٹ اور الفاظ میں ترنم ہے۔ جذبات سیلاب کی طرح امنڈتے اور الفاظ کا جامہ پہنتے چلے جاتے ہیں مطالب معنوی قابل ستایش اور رعایت لفظی حظ آفریں ہے۔

ولی نے صرف اپنی ہی غزلیات پر مخمس کہے ہیں۔ اسکی وجہہ ایک یہہ ہو سکتی ہے کہ ولی کو شعرائے قدیم کی طرح فارسی غزلوں پر اردو مصرعے لگا کر مخمس کہنا پسند نہ ہو دوسرے اس عہد کے شعرائے اردو کے کلام کو وہ اس قابل نہ سمجھتا ہو کہ وہ اسپر مصرعے لگا کر مخمس کہے۔ ولی کے مخمسات سے چند اشعار "مشتی از خرواری" ہدیۂ نظر ناظرین ہیں ؎

تجھ قد نے مجھ نگاہ کوں عالی نظر کیا | تجھ مکھ نے شوق بدر کوں دل سوں بدر کیا

لب نے ترے عقیق کوں خوں میں جگر کیا — مستی نے تجھ نین کی مجھے بے خبر کیا
دل کوں مرے بھنواں نے تری جیوں بھنور کیا

تیرے درس میں علم معانی پڑھا ہے جی — تجھ مکھ کو دیکھ شرح بھی شمسیّہ کی لکھی
بیلاونی تو خواب میں پائی ہے منتہی! — ہر شب تری زلف سوں مطول کی بحث تھی
تیرے دہن کوں دیکھ سخن مختصر کیا

---

(۲)

یہ حرف راست جا کے کہو خرقہ پوش کوں — اے کج خرام چھوڑ دے ظاہر کے جوش کوں
دیتے نہیں ہیں ساغرِ دل خود فروش کوں — وحدت کے میکدے میں نہیں بار ہوش کوں
اس بے خودی کے گھر کی طرف سدھ کوں ڈال چل

دینِ محمّدی سوں ہے دو جگ کی آبرو — مطلوب ہے یہ اسکوں جو ہے کفر کا عدو
کر مختصر جہاں میں دنیا کی جستجو — اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو
دنیا کے رہگزر میں بزرگوں کی چال چل

---

(۳)

شوق تیرا ہوا ہے جن کوں امام — ان نے پایا ہے مدعائے تمام
عشق تیرے میں ہے حیات دوام — عاشقوں کوں نہیں ہے موت سوں کام
مرقدِ پاک اولیا کی قسم

سرکشوں سوں ہے راہِ عرفاں دور — ان کو یک آن نہیں ہے بار حضور!
خود نمائی کا ترک یاں ہے ضرور — خاکساری ہے حق اگے منظور!
خاکِ درگاہِ مصطفےٰ کی قسم

نقشِ دنیا کا کہیں مت دل پر دشمنِ ہوش ہے محبتِ زر
عشق کی راہ میں قدم کوں دھر دل سوں اپنے نکال خوف و خطر
راہ سیدھی ہے رہنما کی قسم

(۴)
تیرے قدم کے فرش رہ بہر نین سب دن اچھو تجھ نقش پا مجھ سیس کا حب الوطن سب دن اچھو
مجھ چاہ کے یوسف کوں یہ چاہِ ذقن سب دن اچھو غنچہ نمط تجھ باس کا دل پیرہن سب دن اچھو
تجھ نین کے نعلیں میں تیرے چرن سب دن اچھو
یٰسٓ وطٰہٰ والضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں وَالیلِ اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے دھیان میں
افلاک سب پیدا ہوئے لولاک کے الحان میں تجھ یاد سے راحت اچھو حرمومناں کی جان میں
تیرے چرن کی خاک سوں روشن نین سب دن اچھو

(۵) نہ تنہا حسنِ خوباں دلربا ہے ادا فہمی سخن دانی بلا ہے
سخن داں آشنا فضلِ خدا ہے صنم میرا سخن سوں آشنا ہے
مجھے فکرِ سخن کرنا بجا ہے
عجب تجھ بر میں ہے اے یارِ جانی نشاطِ دل لباس زعفرانی
ترے جلوے سوں پایا ہوں جوانی نہ بخشے کیوں ترا خط زندگانی
کہ موج چشمۂ آبِ بقا ہے

(۶) چھپ ہے تیری نشۂ صہبائے حسن رنگ ہے تیرا چمن آرائے حسن
قد ہے تیرا رحمت والائے حسن زلف تیری تجھ مکھ پہ اے دریائے حسن
یہہ کلی ہے گلشنِ امید کی

ترجیع بند ترجیع بند بھی شاعری کی ایک اچھی صنف ہے۔ غزل کی طرح ایک مطلع اور بحر کئی اشعار متفق یا مختلف المضامین لاکر ایک بیت کی جسکا قافیہ الگ ہوتا ہے گرہ لگائی جاتی ہے۔ یہہ بیت اپنی اصلی حالت پر قائم رہتی ہے اور ہر بند کے آخر میں بار بار لائی جاتی ہے۔ ولیؔ کے ترجیع بند اگرچہ مضمون اور مطالب کے لحاظ سے بلند پایہ نہیں لیکن سلاستِ بیان اور لطافتِ زبان قابلِ تعریف ہے۔ ملاحظہ ہو؎

(۱) مرے دل میں وہ سروِ گلفام ہے کہ جس شوخ کا خوش ادا نام ہے
رخِ روشن و زلفِ مشکینِ یار! مجھے یاد ہر صبح و ہر شام ہے
شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں
بزورِ نزاکت بزورِ ادا !!! صفِ گلرخاں کا ہے تو مقتدا
بجا ہے سنو گر مرا التماس! کہ سنتے ہیں شہ عرضِ حالِ گدا
شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں
ترے دیکھنے کوں اے نرگس نین! چلے چھوڑ آہو دیارِ ختن !!!

کیا دل نے تیری گلی میں مقام　　　کہ دائم ہے بلبل کا گلشن وطن
شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں
ترے حسن کا نازنیں یو نقاب　　　جھلکتا ہے جیوں مطلعِ آفتاب
بجا ہے ترے حسن کی آب سوں　　　تری زلف کھاتی ہے گر پیچ و تاب
شتابی خبر لے کہ بے تاب ہوں
ترے عشق میں بے خور و خواب ہوں

ولی کا دوسرا ترجیع بند شاہ وجیہہ الدین قدس سرہٗ کی شان میں ہے۔ یہہ ترجیع بند اپنے زورِ کلام کی بدولت اس دور کے ادب کا ایک اعلےٰ نمونہ ہے۔ جذباتِ عقیدت اور تاثراتِ مودت نے یوں بھی اس کو ایک خاص شان عطا کی ہے جسکو شوکتِ الفاظ نے اور بھی بڑھا دیا ہے

(۲) اے تو مقبولِ سرورِ عالم　　　وے تو فہرستِ دفترِ عالم
دلِ عرفاں سرشت ہے تیرا　　　مظہرِ خلق و مظہرِ عالم
تجھ اوپر جیوں سرج ہویدا ہے　　　مطلبِ جملہ مضمرِ عالم
اے امامِ جمیع اہلِ یقیں
قبلۂ راستاں وجیہہ الدین
اے تو ہے آفتابِ عالمتاب　　　فیض تیرے سوں جگ ہے مقصدیاب
دل ترا کانِ علم بحرِ عمل　　　اور معانی ہیں اسمیں دُرِ خوش آب

اے تو مجموعۂ فراستِ تام — دل ترا مطلب ہزار کتاب

اے امامِ جمیع اہلِ یقیں

قبلۂ راستاں وجیہہ الدین

اے گلِ گلشنِ حسین و حسن — تجھ سوں روشن ہوا زمین و زمن

گوہرِ فکر تجھ سوں ہے سیراب — جوہرِ عقل تجھ سوں ہے روشن

یوں توں ہے انتخاب عالم میں — جیوں کہ ہر آدمی میں نطقِ سخن

اے امامِ جمیع اہلِ یقیں

قبلۂ راستاں وجیہہ الدیں

قطعہ غزل یا قصیدے کا ٹکڑا جو کسی مسلسل معنی کا حامل ہو قطعہ کہلاتا ہے۔ قطعہ میں دو شعر ہوتے ہیں۔ مطلع ضروری نہیں۔

قطعات میں ولی کا تخیل ارفع اور معنی خیز ہے ؂

(۱) حسن دلبر کا خواب میں دیکھا — نورِ حق تھا حجاب میں دیکھا

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا — یہہ تماشا حباب میں دیکھا

(۲) گنجِ مخفی کی نہیں کنجی ہے بسم اللہ بن — قفلِ دل کھلتا نہیں ہے گا ہمارا آہ بن

رودِ نیل آنکھوں سے جاری ہے ندی نالے ہے آب — باولی ہو گئی ہے یوسف کی زلیخا چاہ بن

(۳) یوسفِ حسن آج دستا ہے — جا کے لینے کوں جیوں ترستا ہے

مدعی کوں کہو کہ جیو دیو نگا — وہ نہ دیونگا جو جیو میں بستا ہے

رباعی

رباعی میں ایک خیال کو دو اشعار میں ادا کیا جاتا ہے۔ پہلا دوسرا اور چوتھا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ تیسرا مصرعہ قافیہ سے بری رہتا ہے۔ یوں تو رباعی کے اوزان ۲۴ بتائے جاتے ہیں لیکن صرف چند اوزان مستعمل ہیں۔ اصل وزن لاحول ولاقوۃ الا باللہ ہے۔ رباعیات میں ولی کا تخیل بہت گہرا جاتا ہے۔ ان میں مطالب بھی ہیں اور معنی آفرینی بھی۔

(۱)

دیوانِ ازل بیچ خدائے بے چوں یہہ حکم کیا عام کہ ہاں کن فیکوں
افراد دو عالم کا بندھا شیرازہ اس دفترِ کونین پہ فہرست ہی توں

(۲)

دل جامِ حقیقت ستی جو مست ہوا ہر مستِ مجازی سوں زبردست ہوا
یہہ باغ و بستاں نظر میں تنکے سوں کم اور عرشِ عظیم پگ تلے پست ہوا

(۳)

منصور تری دار اوپر حیراں ہے قضات تری راہ میں سرگرداں ہے
دربار میں تیرے نہیں موسےٰ کوں بار یہہ نور ترا بوجھ ترا درباں ہے

تعشّق و تغزّل

جیسا کہ ہم نے اس سے قبل بیان کیا ہے ولی ایک غزل گو شاعر ہے اسکا کمال فن تغزل ہی میں نظر آتا ہے۔ اس کی غزلیات میں وہ سب کچھ ہے جس کو اردو غزل کا سرمایہ کہہ سکتے ہیں محرکاتِ عشق۔ وارداتِ عشق۔ نتائجِ عشق۔ تاثراتِ حسن۔ مطلوب کی بے نیازی۔ طالب کی آہ و زاری۔ حزن و ملال۔ امید و بیم۔ جوشش و اثر۔ سوز و گداز غرض مشرقی شاعری کا کوئی ایسا پہلو نہیں جس کی ترجمانی ولی کے قلم جادو رقم نے نہ کی ہو۔ تغزل میں ولی کا تخیل اثر آفریں۔ جدت طراز اور فلک پیما ہے اسکا طائرِ خیال جب پر تول کر اڑتا ہے تو سدرۃ المنتہیٰ کی خبر لاتا ہے۔

ولی جدید اردو کا پہلا شاعر ہے جسنے باقاعدہ ردیف وار اور حروف تہجّی کے لحاظ سے غزلیں لکھیں۔ اگرچہ بعض اہل قلم نے اسکو پہلا مدوّن ماننے سے انکار کیا ہے۔ چنانچہ آزاد کے اس تبصرہ پر جو انہوں نے ولی کی غزل گوئی پر کیا ہے۔

"نظم اردو کا پہلا نوروز ہے۔ نفسِ ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی مگر بچہ تھی نیند پڑی سوتی تھی۔ ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی اور اثر اس کا دفعتہً حرارت برقی کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے ....

"یہ نظم اردو کی نسل کا باوا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا

جس میں وقت کے محاورے نے اپنے جواہرات خرچ کئے اور مضامین کے رائج الوقت دستکاری سے میناکاری کی۔ جب کشور وجود میں پہونچا تو ایوان مشاعرہ کے صدر میں اسکا تخت بچھایا گیا............ انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو........"

سید عبدالحی صاحب اپنے تذکرۂ گل رعنا میں لکھتے ہیں :۔

"ناواقفیت کی وجہہ سے عام طور پر یہہ خیال چلا آتا ہے کہ ریختہ میں سب سے پہلے ولی نے دیوان مرتب کیا اور اسی بنا پر مولوی محمد حسین آزاد نے اردو نظم کی اولیت کا تاج ان کے سر پر رکھدیا ہے۔ اور اردو نسل کا آدم انکو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں ان کو وہ رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے حالانکہ ان سے سوسوا سو برس پہلے ریختہ میں شاعری اس حد تک پہونچ گئی تھی کہ اس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ ۔ محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں"

عبارت متذکرۂ بالا میں "سوسوا سو سال" کی قدامت کے ساتھ "اس بے تکلف" کی لطافت قابل غور ہے ۔ حالانکہ اہل علم جانتے ہیں کہ قطب شاہی سلاطین کے جن دیوانوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ ولی اورنگ آبادی سے بہت قبل کے کلام پر مشتمل ہیں اور ٹھیٹ دکنی اردو میں لکھے گئے ہیں اسلئے عہد حاضر کے اہل اردو کے لئے انکی زبان اتنی غیر مانوس اور انکا اسلوب بیان اتنا غیر مطبوع ہے کہ اگر ان کے

دیوانوں سے عام فہم کلام منتخب کیا جائے تو بہت کم ایسا ملے کہ (بقول احسن مارہروی صاحب)
"وہ جسکے لفظی مفہوم کو نہ صرف اہل دہلی ہی بہ تکلف سمجھ سکیں گے بلکہ دکنی مخلوق بھی
ہجے کئے بغیر مطلب نہ بتا سکے گی۔ بخلاف اس کے ولی کا تمام سرمایۂ نظم بائے بسم اللہ
سے تائے تمت تک اردو کے لئے مایہ ناز و افتخار ہے"

اسی بناء پر مصنف تذکرۂ شعرائے دکن نے بھی ولی کو نظم اردو کا باوا آدم یا تغزل کا پہلا موجد ماننے سے انکار کیا ہے۔ بعض تذکرہ نویسوں نے علی ابراہیم خاں خلیل مولف تذکرۂ گلزار ابراہیم کو ولی کے کمال کا اعتراف کرنے اور "اول کسے است کہ دیوانش در دکہن مشتہر و مدوّن گشتہ" لکھنے پر اور میر تقی میر کو نکات الشعرا میں اس کے کمال کو سراہنے اور "از کمالِ شہرت احتیاج تعارف ندارد" فرمانے پر ناک بھوں چڑھایا ہے۔ اسمیں کوئی شک نہیں ہے کہ ولی سے قبل دواوین قطب شاہیہ مرتب کئے گئے اور اردو شاعری کی ایک بہت بڑی خدمت کی گئی لیکن اُن کی زبان بہت قدیم تھی اور ان کے اسلوب میں ہندیت نمایاں تھی۔ ولی بعد کے زمانہ کا شاعر تھا اور اس کے علاوہ سیر و سیاحت کی وجہہ سے اس کی زبان میں وسعت اور اسکے اسلوب میں روانی پیدا ہوگئی تھی اس لئے یہہ کہنا پڑتا ہے کہ اس موجودہ زمانے میں بھی جبکہ نہ صرف سلاطین قطب شاہیہ کے دواوین ہی بلکہ دوسرے قدیمی شعرائے دکن کے کلام بھی منظر عام پر آچکے یا آتے جا رہے ہیں ولی کی امتیازی شان میں کوئی فرق نہیں آسکتا بہت ممکن ہے کہ نصرتی کے قصائد، وجہی، رستمی، غواصی اور ابن نشاطی کی مثنویاں عشرتی، طبعی اور صنعتی کی ادبی نظمیں۔ نصرتی افضل وغیرہ کی مرقع نگاری ولی سے بڑھکر آب و تاب رکھتی ہو لیکن اسوقت تک ولی سے پیشتر کی جتنی غزلیں شایع ہوئی ہیں ان کے مطالعہ سے

معلوم ہوتا ہے کہ دکن کا وہ تغزل جو ولی سے پہلے تھا ولی کے تغزل سے لگا نہیں کھا سکتا۔ یہاں ہم تین مشہور شعرا کی مشہور غزلیں نقل کرتے ہیں۔

غزل سلطان عبداللہ قطب شاہ

کسے پیار کرنا کہاں ہے پیارا ہمیچ ہیں ہمارے نہیں کئی ہمارا
ہمیں دل لگاتے وو دل نیں لگاتے تو اس دل لگانے کوں کیا ہی پتیارا
عشق کا لذت وو جو معشوق منگیتا نہیں تو عشق نیں یو محنت ہی سارا
ایکس کے بدل ایک نپتا مزا ہے جو یوں ہوئے تو دل لائے دل لا نہارا
نبی صدقے عبداللہ بولیا یو بولاں
کہ جیوں پھول چن چن کے گندتا پھلارا

غزل وجہی

پیو اپنے کوں ٹک آج ہیں نس سپنے دیکھی سوکر جب پیو چلیا سٹ سیج ہنج تب سوتے اٹھی روکر
ہاتھ بڑھا اپنا سارنے ہنج چل چل لاگیا مارنے نا جاؤں سائیں کارنے بھی اجیوں کیا کیا ہوکر
نا پوچھوں ہمن ہوؤ سے کب ملتا پیو سوں ہوؤ سے غم برہا سب ہیں سوؤ سے نا جانے دکھ یو کوئی کر
کیوں ٹالوں برہا جھال سکی نیں سکتی ہوں سنبھال سکی اب کیونکر پاؤں لال سکی جو بیٹھی ہت تے کھوکر
یکتا ہیں سہیلی مرنا دل دوجے پر نا دھرنا !! اس پیو کو اپنا کرنا اِس پاپی جیو کوں کھو کر

غزل محمد قلی قطب شاہ

گر جا ہے میگہ سر تھے تازہ ہوا ہے بستاں — پھولاں کی باس پایا بلبل ہزار دستاں
اے خوش خبر صبا توں لے جا جواں قداں کن — جھماں کی آرزو میں بیٹھے ہیں ہوئے پریشاں
او نونہال پھولاں ہے جام خوئے سو بادہ — نرگس ایس پلک سوں جھاڑو کرے شبستاں
مکھ نور پر دسے یوں مج خط عنبریں او — جوں سورا پر ہے بادل ریحان سوں گلستاں
بے ہوش ہیرے دل کوں مٹھے ادھر جلائے — گلزار ہے عجیب او دو لعل شکرستاں
مج عشق کے گدا کوں او رنگ شاہی دیتا — سب عاشقاں منج انگے ہیں طفل جوں دبستاں
روزی ہوا قطب شہ تج عشق کا پیالہ — بھر لے ہیں ہر طرف توں جم شوق کے خمستاں

اب ہم ولیؔ کی تین پوری غزلیں نقل کرتے ہیں جو کسی طرح اس کی شاعری کے عام معیار سے بلند نہیں ہیں تاکہ اس کے معیارِ کلام کا اندازہ صحیح طور پر ہو سکے۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ ولی کا تغزل اور زبان دونوں نقش ثانی کا حکم رکھتے ہیں۔

غزلیاتِ ولیؔ

ہوا ہوں بے خبر تجھ مست انکھیاں کی خبر سن کر — ہوا ہوں ناتواں جیوں ہو تری نازک کمر سن کر
نہیں تجھ لعل شیریں پر خطِ سبز اے گلستاں رو — یہہ طوطی ہے کہ آئی ہے ترے لب کی شکر سن کر
پرت کے پنتھ میں ہرگز قدم پیچھے نہ رکھ اے دل — ہٹاتے ہیں قدم نامرد اس رہ کا خطر سن کر

بگولے کی نمط آتا ہے مجنوں بے سر و بے پا میرے دیوانۂ دل کوں الپس کا راہبر سن کر
صبا کے ہاتھ سوں جیوں ہی ہر اک غنچہ پریشاں دل یومیں ہر دل پریشاں ہے مری آہِ سحر سن کر
ولیؔ تیری گلی کوں سن کے یوں مشتاق ہیں سب دل لہ جیوں عشاق ہوں مشتاق وصفِ موکر سن کر

(۲)

ہوا نہیں وہ صنم صاحب اختیار ہنوز بجائے خود ہے رقیباں کا اعتبار ہنوز
پری رخاں کی جھلک کا کیا ہوں بسکہ خیال برنگ برق مرا دل ہے بے قرار ہنوز
ہزار بلبلِ مسکیں کا صید ہے باقی مقیم ہے چمن حسن میں بہار ہنوز
بجا نہیں تجھے انکار خونِ عاشق سوں گیا نہیں ہے ترے ہاتھ سوں نگار ہنوز
الپس کی چشم کی گردش سیں دے پیالہ مجھے گیا نہیں ہے مری چشم سوں خمار ہنوز
بجائے خود ہے اے رنگیں بہار گل فطرت تری پلک کا مرے دل میں خار خار ہنوز
چلے ہیں آہوئے مشکیں ختن سوں سنکے کہ ہے نگاہ شوخ صنم در پئے شکار ہنوز
ولیؔ جہاں کے گلستاں میں ہر طرف ہے خزاں ولے بحال ہے وہ سروِ گلعذار ہنوز

(۳)

خدایا ملا صاحب درد کوں ! لہ میرا کہے درد بے درد کوں
کرے غم سوں صد برگ صد پارہ دل دکھاؤں اگر چہرۂ زرد کوں
ہٹا بوالہوس تجھ بھواں دیکھکر نہیں تاب شمشیر نامرد کوں
اگر جل میں جلکر کنول خاک ہو نہ پہونچے ترے پاؤں کی گرد کوں

رکھا تجھ دہن کی صفت ہیں ولؔی ہراک فرد میں جوہر فرد کوں

اس میں کوئی شک نہیں کہ محمد حسین آزاد قلم کی روانی میں بہت سے بے تحقیق بلکہ مضحکہ خیز واقعات لکھ گئے ہیں جیسے ولؔی کے بُعد زمانی کو بتاتے ہوئے فرماتے ہیں "دیناتین سو برس دور نکل آئی ہے"، لیکن ولؔی کو چاسر اُردو کا خطاب بخشنے اور اولیت کا تاج عطا کرنے میں انہوں نے نہایت انصاف پسندی۔ صداقت اور حقیقت شناسی سے کام لیا ہے۔ جس طرح چاسر سے پہلے شعرا مقامی زبانوں میں کلام موزوں کرتے تھے لیکن وہ مقامی بولیاں کسی طرح ملکی زبان نہیں کہلائی جاسکتی تھیں۔ چاسر پہلا شاعر تھا جسنے ایک ایسی زبان میں شاعری کی جو کم وبیش ملک کے ہر حصے میں سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح ولؔی نے بھی اپنے کلام کو ایک ایسے پاکیزہ سانچے میں ڈھالا جو ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پسند کیا گیا اور ایک ایسی میٹھی عام فہم زبان کی داغ بیل ڈالی جو صرف اس دور ہی میں نہیں بلکہ دو سو سال گذر جانے کے بعد بھی تمام ہندوستان میں سمجھی ہی نہیں جاتی بلکہ سراہی جاتی ہے اور ہر سخن شناس دل اب بھی ان میٹھے بولوں کے مزے لیتا ہے۔

لچھمی نرائن صاحب شفیقؔ اورنگ آبادی چمنستان شعرا میں لکھتے ہیں:—

"درازمنہ ماضیہ موزونان این جا شعر را بزبانِ ریختہ گفتہ اند اما صاحب دیوانے باایں متانت و فصاحت از کتم عدم سر نکشید و شعرائے سلف چند طوطی شکر مقال بوستانِ سخن دانی اند لیکن چنین بلبل ہزار داستاں بہ گوش نہ رسید۔ آرے والیِ ولایت نازک خیالی و شہنشاہ قلمروئے خوش مقالی است"

کاشف الحقایق میں ولؔی کی غزل گوئی کی تعریف اس طرح کی گئی ہے:—

"غزل گوئی کے اعتبار سے ولیؔ اول درجے کے شاعر تھے۔ جو غزل گوئی کے تقاضے تھے ان سے ولی کو پوری اطلاع حاصل تھی۔ چنانچہ غزل گوئی میں بیشتر شاعری کا داخلی پہلو پیش نظر رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزل سرائی پر تاثیر نظر آتی ہے۔ ولیؔ کے کلام میں دردؔ، سوداؔ، میرؔ، مصحفیؔ، ذوقؔ، ناسخؔ، آتشؔ سب کے رنگ بکثرت موجود ہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس قدر قوی الدّماغ شاعر تھے جو ہر نوع کے کلام پر قدرت تامہ رکھتے تھے حقیقت یہہ ہے کہ مابعد کے جتنے متغزلین موجد کسی طرز کے کہلاتے ہیں درحقیقت اسی پیر طریقت کے مرید ہیں"

خود قدمائے بھی ولیؔ کی استادی کا اعتراف کیا ہے حاتمؔ کہتے ہیں ؎

حاتمؔ یہہ فن شعر میں کچھ تو بھی کم نہیں لیکن ولیؔ ولی ہے جہاں میں سخن کے بیچ

آبروؔ نے ولیؔ کی کرامت کو یوں تسلیم کیا۔

آبروؔ شعر ہے ترا اعجاز پر ولیؔ کا سخن کرامت ہے

بزم شعراء میں میر صاحب کی میر مجلسی مسلم ہے نہ کسی میں ویسا سوز و گداز ہے نہ کسی میں وہ بے ساختگی و اثر ہے۔ غالبؔ کہتے ہیں ؎

غالبؔ اپنا تو عقیدہ ہے بقول ناسخؔ آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

لیکن یہہ شہنشاہ اقلیم غزل گوئی بھی ولیؔ کو اپنا رہنما اور محبوب مانتا ہے دیکھئے میرؔ صاحب کس حسن سے ولیؔ کے کمال کا اعتراف کرتے ہیں ؎

خوگر نہیں کچھ یوں ہی ہم ریختہ گوئی کے معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا

اور یوں شاعری کی جو پوچھئے تو ہر انسان فطرتاً شاعر پیدا ہوتا ہے۔ ہم نے بارہا ننھے بچوں کو جنکے بول بھی درست نہیں ہوتے تک سے تک ملاتے اور ہم وزن کلمات کو ترنم سے گاتے سنا ہے اسی لئے شاعری قوموں کی مادری زبان کہلاتی ہے۔ موسیقی اور شاعری اولاد آدم کی گھٹی میں پڑی ہے زمانے کا تاریک سے تاریک دور بھی ان سے خالی نظر نہیں آتا پھر کیسے ممکن ہے کہ گولکنڈہ کا وہ زرین دور جو اپنی ادبی ترقیوں کی بدولت اہل دکن کے لئے ہمیشہ باعث ناز رہیگا اس امتیاز سے محروم رہے۔ دکن میں اردو زبان اس وقت بھی ادبی تصنیفات کے قابل بن چکی تھی جبکہ خاص دہلی میں بھی جہاں اس زبان نے اپنے ارتقائی مدارج طے کئے۔ امیر خسرو کے فارسی آمیز ہندی دوہے گائے جاتے تھے یا محض فارسی یا برج بھاشا میں شاعری کی جاتی تھی۔ باوجود اس ترقی و ارتقائے ادب کے۔ تاریخ ادب اردو کے جاننے والے جانتے ہیں کہ ولی کی اور ولی سے قبل کی دکنی شاعری میں کیا فرق ہے۔ ولی سے پہلے کے شاعروں کی زبان بہت قدیم ہے اور ہمارے لئے اسکا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ اس میں ہندیت کا عنصر غالب تھا۔ اکثر صنف نازک کو طالب کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا غزلیں کم لکھی جاتی تھیں اور ان میں بھی زیادہ تر اظہار محبت اشتیاق وصل اور درد فراق کی ترجمانی ہوتی تھی برخلاف اسکے ولی کی غزل ان گنت خیالات۔ تاثرات اور مضامین پر مشتمل ہے۔ اس کے کلام میں فلسفیانہ۔ معاشرتی۔ اصلاحی۔ اخلاقی۔ عشقیہ۔ فخریہ غرض ہر قسم کے مضامین اور خیالات موجود ہیں اور پھر انداز بیان ایسا پاکیزہ اور زبان اتنی سلجھی ہوئی کہ وہی زبان دوسروں کو تقریباً ایک صدی بعد نصیب ہوئی۔

گر ہم ولی کے دور اور ماحول پر غور کریں تو اس کا شاعرانہ وقار اور بھی بڑھ جاتا ہے۔

دکن کی اُس غمگین فضا میں اور اس دنیائے درد و غم میں رہ کر جبکہ وطن کا ذرہ ذرہ قطرۂ خون بنا ہوا تھا ولی کا اس خوش الحانی سے غزل سرا ہونا اور اِس صدائے آہ کو واہ سے بدل دینا درحقیقت جیتی جاگتی کرامت ہے۔ ریاض کا یہہ شعر ولی کی شاعری پر پوری طرح منطبق ہوتا ہے کہ ؎

شوخی سے ہر شگوفے کے ٹکڑے اڑا دیئے جس غنچہ پر نگاہ پڑی دل بنا دیا

تعجب ہوتا ہے کہ باوجود اپنے رنگ کا پہلا شاعر ہونے کے ولی نے اپنی غزلوں میں ایسی رنگا رنگ تجلیاں کیسے پیدا کیں اپنے لامحدود تخیل کو ایسے مختصر سانچوں میں کیسے ڈھالا۔ اتنی دلکش نغمہ سنجیاں کہاں سے سیکھیں اور اپنے کلام کے لئے اتنی میٹھی زبان کیونکر بنائی کہ اگر امتداد زمانہ سے بدلے ہوئے الفاظ کو جو بہ نسبت صحیح اور فصیح الفاظ کے بہت ہی کم ہیں بدل دیا جائے تو دو صدی پہلے کی زبان پر دو صدی بعد کا دھوکا ہوتا ہے ولی کی چھوٹی بحر کی غزلیں تقریباً سب اسی قبیل کی ہیں نمونتاً دو غزلیں ملاحظہ ہوں۔

(۱)

اب جدائی نہ کر خدا سے ڈر بے وفائی نہ کر خدا سے ڈر
راست کیشوں سے اے کماں ابرو کج ادائی نہ کر خدا سے ڈر
مت تغافل کو راہ دے اے شوخ جگ ہنسائی نہ کر خدا سے ڈر
ہے جدائی میں زندگی مشکل آ۔ جدائی نہ کر خدا سے ڈر
آرسی دیکھکر نہ ہو مغرور خود نمائی نہ کر خدا سے ڈر
اے ولی غیر آستانۂ یار! جبہہ سائی نہ کر خدا سے ڈر

(اس غزل میں صرف کون کو کو سے اور سون کو سے سے بدلا گیا ہے)
اسی ردیف و قافیہ میں تقریباً ولی سے ڈیڑھ سو برس بعد دہلی کی ایک طوائف کہتی ہے (خیال رہے کہ یہہ ولی کی ٹکسالی زبان ہے اور ڈیڑھ صدی کی ترقی کے بعد)

بے وفائی نہ کر خدا سے ڈر	خود نمائی نہ کر خدا سے ڈر
بے وفاؤں سے کیا وفا ہوگی	آشنائی نہ کر خدا سے ڈر
دست نازک کا کچھ خیال نور کھ	یوں کلائی نہ کر خدا سے ڈر

ہے سخن رات دن ترے قربان
اب جدائی نہ کر خدا سے ڈر

ذیل کی غزل میں زبان کی سلاست۔ تخیل کی بلندی اور بندش کی چستی ملاحظہ ہو۔

(۲)

یاد کرنا ہر گھڑی اس یار کا!	ہے وظیفہ مجھ دلِ بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں	تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
عاقبت ہوئے گا کیا معلوم نئیں!	دل ہوا ہے مبتلا دلدار کا
گر ہوا ہے طالبِ آزادگی!	بند مت ہو سبّحہ و زنّار کا
مسندِ گل منزلِ شبنم ہوئی	دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا
اے ولی ہونا سری جن پر نثار	مدعا ہے چشمِ گوہر بار کا

کسی کے نقشِ قدم پر چل نکلنا یا ہلکے خطوط کو گہرا کر دینا مشکل کام نہیں۔ کام تو مشکل اُس کا ہے

جو پہلے پہل دشوار گذار گھاٹیوں میں راہ نکالے اور آنیوالوں کے لئے نقشِ قدم چھوڑ جائے۔ ہماری زبان پر شعرا کا احسان ہے جنھوں نے نئی نئی ترکیبوں۔ خوبصورت تشبیہوں اور الفاظ سازی سے ہمارے لفظی خزانوں کو مالا مال کر دیا اپنی ندرت خیال اور مضمون آفرینی سے ادب کو ترقی دی لیکن اس ساری ترقی کا سہرا اس کے سر ہے جو اِس کشتی کا پہلا سوار تھا اور جسکی شمع نے ہزاروں کے چراغ روشن کر دئے۔ ذیل کے اشعار اس صداقت کا ثبوت دیتے ہیں۔

ولی ۔ بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہی غریب — بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی

میر — کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو یار آتا — سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

غالب — آج ہم اپنی پریشانی خاطر انسے — کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

امیر — یہہ کہونگا یہہ کہونگا یہہ ابھی کہتے ہو — سامنے انکے بھی جب حضرتِ دل یاد رہے

داغ — یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم — بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

کیا زبانِ اردو کے اِن مستند معماروں نے اس نہج سے فائدہ نہیں اٹھایا جو اس کے معمار اول نے اختیار کیا تھا۔ تمثیلاً چند اور اشعار ہدیہ ناظرین کئے جاتے ہیں جن میں ولی نے ایسے مضامین باندھے ہیں جنکو اپنے انداز میں نظم کرنا ہر شاعر کا ایمان ہے۔ خیال ہیں کسیقدر رد و بدل ضرور کیا گیا لیکن اِس عمارت کا سنگِ بنیاد وہی ہے جو ولی نے اپنے مقدس ہاتھوں سے رکھا تھا۔

ولی — رات دن جگ میں رفیقِ بے کساں — بے کسی ہے بے کسی ہے بے کسی

درد — آنکھیں بھی ہائے نزع میں اپنی بدل گئیں — سچ ہے کہ بے کسی میں کوئی آشنا نہیں

جرأت — نہ ہم دم کوئی خاب ہم نشیں — برے وقت کا کوئی ساتھی نہیں

بے نظیر شاہ — مصیبت میں آنکھیں کھلیں اب تو دیکھا — چھپاتے ہیں منہ مہرباں کیسے کیسے
امیر — پتلیاں تک بھی تو پھر جاتی ہیں دیکھو دم نزع — وقت پڑتا ہے تو سب آنکھ چرا جاتے ہیں

ولی — کرتی ہے دل کوں بے خود اس دلربا کی گالی — گویا ہے جام شربت اس خوش ادا کی گالی
غالب — کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب — گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا
مومن — دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں — اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
ریاض — پاؤں تو ان حسینوں کے منہ چوم لوں ریاض — آج ان کی گالیوں نے بڑا ہی مزا دیا

ولی — عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اسکا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اسکا
شوکت — میں سمجھا قرب جاناں میں کہ پردہ درمیاں کیا تھا — مرے ذوق نظر کی ایک حد تھی آسماں کیا تھا
غالب — محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا
آزاد — عیاں ہے سب میں کہاں ہے مخفی کب اسکا جلوہ نقاب میں ہے — قصور اپنی نگاہ کا ہے وگرنہ کب وہ حجاب میں ہے

ولی — سب کام اپس کے سونپ کے حق کوں نچنت رہ — یہہ ہے تمام مقصد گفت و شنید یاں!
صبا — ناداں ہیں جو رکھتے ہیں امید کسی کی — جز ذات خدا کوئی کسی کا نہیں ہوتا!
میر — کعبہ گئے کیا کوئی مقصد کو پہونچتا ہے — کیا سعی سے ہوتا ہے جبتک نہ خدا چاہے

ولی — فدا کیا ہوں یہہ قامت پہ میں دل و جاں کوں — کہ جسنے فتنۂ محشر سے بے نیاز کیا
غالب — جبتک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم — میں معتقد فتنۂ محشر نہ ہوا تھا
مومن — اک شور ہے مثال قدِ یار سے جو دی — یوں کوں جانتا تھا قیامت کے نام کو

ولی — تو جھو خود بخود موہن میں اڑ ہے — رقیب روسیہ فتنے کی جڑ ہے
اشک — تمھیں اور ہیں کون بہکانے والے — یہی آنے والے یہی جانے والے
غالب — ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا — آپ آتے تھے مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

یہہ وہ مضمون ہے جو مختلف رنگ سے ہر شاعر کے ہاں پایا جاتا ہے۔

ولی — سجن کے باج عالم میں دگر نئں — ہمن میں ہے ولے ہمکو خبر نئں
غالب — اسے کون دیکھ سکتا ہے کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا
داغ — رہے مشتاق جلوۂ دیدار — ہم نے مانا نظر نہیں آتا

ولی — آج تیری نگہ نے مسجد میں — ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
داغ — رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر — آنکھ جس جانب تمہاری اٹھ گئی
اکبر — جس طرف اٹھ گئی ہیں آہیں ہیں — چشم بد دور کیا نگاہیں ہیں
آزاد — وہ کافر نگاہیں خدا کی پناہ — جدھر پھر گئیں فیصلہ ہو گیا

غرض ولی نے مضامین اور خیالات کے دریا بہائے ہیں جو آجتک تشنگانِ ادب کو سیراب کر رہے ہیں۔ اس کے ہاں اکثر مضامین ایسے پائے جاتے ہیں جن کو شعرائے متقدمین۔ متوسطین اور متاخرین نے طرح طرح سے باندھا ہے لیکن تعجب ہے کہ بعض خیال ایسے بھی ہیں جو تقریباً اچھوتے ہیں جیسے

ولی جنونِ عشق ہوا اِس قدر زمیں کو محیط لہر پارسا کو ہوئی موج بوریا زنجیر
" گردِ غم آبِ نین عشق کے معمار سے لے خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا
" اور مجھ پاس کیا ہے دینے کوں دیکھکر تجھ کوں روئے دیتا ہوں

وہ حیات و ممات کے نازک مسائل اس خوبی اور سادگی سے بیان کرجاتا ہے کہ مشکل سے مشکل نکتہ بھی معمولی بات چیت بن جاتا ہے۔ وہ اپنے تغزل ہی میں تصوف و عرفان کی گتھیاں اس خوبی سے سلجھاتا ہے کہ مجاز کے پردے ہی پردے میں حقیقت کی رونمائیاں کیف انگیز اور وجد آفریں نجاتی ہیں مجموعی طور پر ولی کا کلام بلحاظ سوز و گداز۔ سلاست اور اثر آفرینی کے میر کے کلام سے بہت ملتا جلتا ہے۔ ان دونوں استادانِ وقت نے بے ثباتیٔ دنیا۔ قناعت اور استغنا۔ تسلیم و رضا۔ خاکساری۔ تواضع وغیرہ اخلاقی مضامین پر روشنی ڈالی ہے۔ فرق یہہ ہے کہ میر روتے دھوتے بولتے ہیں اور ولی ہنستے بولتے ایک عام خیال ہے کہ فلسفۂ زندگی کے ان اُداس پہلوؤں پر سبق دینا قومی زندگی کو پست کرنا ہے لیکن اگر کوئی ولی کے کلام کا بنظرِ غور مطالعہ کرے تو اس عقیدہ کی کمزوری ظاہر ہوجائیگی ہم ذیل میں چند اشعار نموناً درج کرتے ہیں۔

عرفان جو محبت میں ترے فانی ہوئے ! روز و شب وہ محوِ حیرانی ہوئے
طریق عشقبازی کا عجب نادر طریقہ ہے جو کوئی عاشق نہیں اس کوں مسلماں کر نہیں گنتے

رکھتا ہے دل ہیں دلبر رنگیں خیال کو   مانند آئینے کے جو صاف اعتقاد ہے

اِستغنا

ولی کوں نہیں مال کی ارزو   خدا دوست نئیں دیکھتے زر طرف

اے ولی تیغِ غم سے خوف نہیں   خاکساری بدن پہ جوشن ہے

جنت کو کیا کریگا طلب گار دوست کا   دونوں جہاں ہیں اسکو وہ گلگوں قبا ہے بس

اسباب سی جہانکے ہوں بے غرض سدا ہیں   بن تیل اور بتّی روشن چراغ میرا

پند اور موعظہ

سختی کے بعد عیش کا امیدوار رہ   آخر ہے روزہ دار کوں اک روز عید یاں

عبث غافل ہوا ہے فکر کر کچھ پی کے پانے کا   صفا کر آرسی دل کی سکندر ہو زمانے کا

مجھ کوں ہوپنچی ہے آرسی سوں یہ بات   صاف دل وقت کا سکندر ہے

اخلاق

نجا بزمِ اغیار ہیں شمع رو   کہ اہلِ وفا کا نہیں یہہ طریق

ولی منزل عاقبت ہیں ترا   نہیں کوئی حسنِ عمل بن رفیق

اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو   دنیا کی رہگذر ہیں بزرگوں کی چال چل

فلسفۂ زندگی

یو بات عارفان کی سنو دل سے سالکاں   دنیا کی زندگی ہے یو وہم و گمان محض

اِسی فلسفۂ زندگی کو مرزا غالب اپنے انداز میں اِسطرح بیان کرتے ہیں۔

غالب   ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد   عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

موقوف ہے نمود صور پر وجود بحر   یاں کیا دھرا ہی حلقہ و موج و حباب ہیں

وسیع المشربی

گر ہوا ہے طالب آزادگی بندمت ہو سبحۂ زنار کا

مرزا غالب بھی اِسی خیال کے مقلد ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :۔

غالب زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

حکمت ہمیشہ لشکر آفات سے رہے محفوظ! نصیب جسکوں ہوا ہے حصار خاموشی

مفلسی سب بہار کھوتی ہے مرد کا اعتبار کھوتی ہے

تو بے شک روح ہے جگ میں خلاصہ چار عنصر کا بجز تجھ روح کے قائم نہ ہو جگ کا بدن ہرگز

تخیل بخشی ہے نری نین نے کیفیت مئی تجھ مکھ نے خبردار کیا بے خبری کوں

مسندِ گل منزل شبنم ہوئی دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

ترے فراق میں ہر آہ اے کماں ابرو گئی ہے چرخ پہ تیر شہاب کے مانند

اب ہم چاہتے ہیں کہ ولی کے زورِ تخیل اور ندرت خیال پر ایک اجمالی نظر ڈالیں اور اِن رجحانات کے لحاظ سے جو اسکی شاعری میں نمایاں حثیت رکھتے ہیں عنوان قائم کرکے ہرایکا الگ الگ ذکر کریں۔

دوست کا سراپا

سراپا نگاری ولی کا خاص مضمون ہے۔ تقریباً اسکا ایک تہائی کلام محبوب کی سراپا نگاری اور اس کے قیامت زا حسن کی تعریف پر مشتمل ہے۔ ولی نے اپنے دوست کے چہرے مہرے آنکھ۔ ابرو رخسار۔ لب۔ پیشانی۔ قد قامت۔ زلف۔ خط و خال۔ نوک و پلک یہاں تک کے آنکھ کی پتلی کی

تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ وہ صرف اپنے ساجن کا سراپا ہی ایک سرشار محبت کی حثیت سے نہیں کھینچتا بلکہ اُسکی چال ڈھال ۔ ناز و انداز۔ متانت و وقار اور لباس کی ایسی رنگین۔ حسین اور اپنے زورِ تخیل سے جیتی جاگتی تصویریں اتارتا ہے کہ صاحبانِ ذوق سلیم کا دل ان پر لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے ۔یہاں ہم بہت اختصار سے کام لیکر سراپے کے صرف وہی اشعار پیش کرینگے جنکی تعداد بہت زیادہ ہے ۔

غزل سراپا

(۱)

کاملیّت کا تجکوں دعوے تھا
حق نے دعوے ترا تمام کیا

گلرخاں خوف سوں ہوئے یکسو
تجھ نگہ نے جب اہتمام کیا

وہ بھویں کیوں نہ ہم سوں ہوں باکجی
ماہِ نو نے جسے سلام کیا

تجھ دہن نے کہ ہیم معنی ہے
دل سیماب ہیں مقام کیا

کاف کو نی ہے اس کمر کا پیچ
سب نے اسکوں سر کلام کیا

حق نے تجھ قد کوں دیکھ مثل الف
خوش خطوں کا تجھے امام کیا

تا کہے خلق تجکوں ماہِ تمام
زلف تیری کوں حق نے لام کیا

نام تیرا ولیؔ نے اے اکمل
شوق سے وردِ صبح و شام کیا

(۲)

جلوہ گر اس کا جب جمال ہوا
نور خورشید پائمال ہوا

فیضِ تشبیہِ قدِ دلبر سے — سروِ گلزار میں نہال ہوا
نشۂ سبزِ خطِ خوباں سے — وا پیِ عالمِ خیال ہوا
یاد کر ابرواں کی بیت بلند — ماہِ نو صاحبِ کمال ہوا
دیکھ تیری نگاہ کی شوخی — ہوشِ عاشق رمِ غزال ہوا

حسنِ محبوب

صنعت کے مصوّر نے صباحت کے صفحے پر — تصویر بنائی ہے تری نور کو حل کر
کتابِ حسن کا یہہ مکھ صفا تیرا صفا دِستا — ترے ابرو کے دو مصرعے سوں اسکا ابتدا دِستا
کیا ہو سکے جہاں میں ترا ہمسر آفتاب — تجھ حسن کی اگن کا ہو اک اخگر آفتاب
غضب ہے چہرۂ رنگیں بہارِ ناز و ادا — بہارِ حسن میں ہے لالہ زارِ ناز و ادا
چہرہ ترے مکھ کی ضیائے حیرت افزا لکھ سکے کیونکر — قلم ہے جوہرِ آئینۂ ناصافِ معنیٰ کا
یہی ہے عرض اس خورشید رو سوں — تو شاہِ حسن ہے تیرا گدا ہوں
مصحفِ مکھ ترا ہے صورتِ فجر — مجھ کوں وَالنَّجمِ وَالھویٰ کی قسم
ترا مکھ دیکھنا ہے واجب العین — ادائے فرض میں خوف و رجا ہیں
تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندر سوں — تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گہر سوں

چشمِ فسوں ساز

بے مست شراب ہوں سرشارِ انبساط — تجھ نین کا خیال مجھے جامِ جم ہوا

مستی نہیں محشر تلک بسرا ہے وہ کو نین کوں
جو تجھ نین کے جام سوں مدھ پی کے متوالا ہوا

کھ ترا بحرِ حسن و زلفاں موج
گردشِ چشم عین طوفان ہے

نین دیول میں پتلی ہے ویا کعبہ میں ہے اسوَد
ہرن کا ہے یو نافہ یا کنول بھیتر بھنور دِستا

ترے نین کے نشے سوں مدام گلشن میں
نین میں نرگسِ شہلا کے ہے خمار سجن

سجن نے یک نظر دیکھا نگاہِ مست سوں جس کوں
خراباتِ دو عالم میں سداں ہے وہ خراب اسکا

مژگاں

دیکھ تجھ پلکاں کوں بولیا عاشق جانباز یو
مرغ دل کے صید کوں جنگل ہی یو شاہین کا

کھلا ہے عقدۂ دل تجھ پلک کی سوزن سوں
ترے نین کا اشارہ ہے قفلِ دل کی کلید

رگ جاں سے ہوا ہی خون جاری
یاد تیری پلک کی نشتر ہے

نگاہِ ناز

ناوک ناز شوخ چشموں کے
دل میں عاشق کے کام کرتے ہیں

کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولی
کام اپنا تمام کرتے ہیں

ہے بسکہ تری نین میں کیفیت مستی
اک دید میں کونین کوں بے ہوش کرے توں

تیری نگاہِ مست کہ ہے جام بے خودی
رکھتی ہے کیفیت کہ نہیں وہ شراب میں

دونوں جہاں کوں مست کرے ایک جام میں
آنکھوں کا تیرے عکس پڑے گر شراب میں

ابروئے رنگین

کیا ہے مصرعِ برجستۂ قوسِ قزح موزوں
فلک مضمونِ رنگیں لے بیا تجھ بیت ابرو سوں

تجھ بھواں کے خم کوں دیکھا جب سنتی اتے قبلہ رد
رات دن رکھتا ہے زاہد مکھ آگے محراب کوں

یہہ مکھ تیرا ہے جیوں مسجد بھواں ہیں جیوں محراب
انکھاں سوں جا کے ہیں واں عشق کی نماز کیا

ہوا جو ہر شناس تیغ معنی اے ہلال ابرو !
کہ جن نے درس پایا ہے تجھ ابرو سوں حمامی کا

اک بار دیکھ مجھ طرف اے عیدِ عاشقاں
تجھ ابرواں کی یاد میں لاغر ہوں جیوں ہلال

دہن نازک

کیا اک بات میں واقف مجھے راز نہانی کا
لکھوں غنچے اوپر حرت اس دہن کی نکتہ دانی کا

لب لعلین

کیا کام اسکوں پھر کے شراباً طہور سے
پی جسنے تجھ لباں سوں شراب دو آتشہ

تجھ لب کی صفت لعل بدخشاں سوں کہونگا
جادو ہیں تیرے نین غزالاں سوں کہونگا

پڑھے گر فاتحہ ظالم لبِ جاں بخش سوں اپنے
شہادت گاہِ عاشق چشمۂ آب بقا ہووے

نشہ بخشی میں مئے سے بہتر ہے
تجھ لباں کی مفرح یاقوت

حسن کے خضر نے کیا لب ریز
آب حیواں سوں جام تجھ لب کا

زلف عنبریں

تجھ زلف حلقہ دار سے مانند عاشقاں
گرداب دیچ ملکے پڑے ہے پیچ و تاب میں

موج دریا کی دیکھنے مت جا
دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

حسن ہے دام بلا زلف ہے دو کالے ناگ
جسکو کالے نے ڈسا اسکوں جلانا مشکل

ایس کی زلف کا فر کیش کی جھلکار ٹک دکھلا
کہ زاہد بے خبر دم مارتا ہے پارسائی کا

پریشانی کے مکتب کا معلّم اسکوں کہہ سکئے
تری زلف پریشاں کا صنم جس سر میں سودا ہے

مکھ ترا جیوں روز روشن زلف تیری رات ہے
کیا عجب یو بات ہے اک ٹھار دن اور رات ہے

خالِ زیبا

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال
حوضِ کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلال

اے صنم تجھ جبیں اوپر یو خال
ہندوئے ہردوار باسی ہے

وہ دل کہ جو تھا سوختۂ آتشِ فراق
پہونچا ہے رخ پہ جا کے صنم کے برنگ خال

ترا مکھ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی
اوپر ابرو کی کشتی کے یو تل جیوں ناخدا دِستا

جگ کے دل اے برہمن کانپتے ہیں مثلِ بید
جب سوں یہہ ہندوئے خال و شمنِ ایماں ہوا

قدِ رعنا

گذر اس سرو قامت کا ہوا ہے جب سوں مسجد میں
موذّن کی زباں اوپر ہمیشہ لفظ قامت ہے

نہ کر شمشاد کی تعریف مجھ پاس
کہ میں اس سرو قد کا مبتلا ہوں

ترا قد مصرعِ برجستۂ دیوانِ خوبی ہے
تری یو بیت ابرو شعر دِستا ہے ہلالی کا

اے سرو ترے قد کستی ہے عید عاشقاں
قرباں کیا ہوں تجھ پہ میں عمرِ ابد کے تئیں

شاخِ گل ہے یا نہالِ راز ہے
سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے

گلستانِ لطافت میں ترا قد سرو رعنا ہے
ہمیشہ نازکی کے آب جو میں جلوہ پیرا ہے

چمن میں دل کے جب گذرے خیال اس سرو قامت کا
سراپا آہِ سردِ سینہ سرو خوش ادا ہووے

خطِ دلبر

نہیں یہہ خط یہ گرد لعل مئے نوش
ہوا ہے چشمۂ خورشید خس پوش

ولی مشکل نہیں ہرگز پہونچنا آب حیواں کوں
اگر خضرِ خطِ خوباں ہمارا رہنما ہوئے

جوہر آئینہ تجھ خط کی سُنیا جب سوں خبر
موج گوہر کی نمن غرق ہوا پانی میں

خط کا آخر کو ہوا رخ پہ پری رو کے گذر
مور کوں راہ ملی ملک سلیمانی میں

یہہ خط اس رخ کے گلشن میں ہی سبزۂ ریحاں
ورق پر حسن کے دیکھو لکھا ہے یہہ خطِ ریحاں

رخسار

پرتو رخسار ترا دیکھ کر اے آفتاب
موج کے پانی نے ڈالی پگ میں زنجیر طلا

نازو انداز

وہ صنوبر قامت گلزار حسن
محشر ناز و ادا ہے الغیاث

زندہ کرنا استخواں کا گرچہ تھا کارِ مسیح
زندہ کرنا شوق کا تجھ ناز کا اعجاز ہے

یو غمزۂ شوخ ساحری نئیں
استاد ہے سحر ساحری کا

ادا و ناز سوں آتا ہے وہ روشن جبیں گھر سے
کہ جیوں مشرق سے نکلے آفتاب آہستہ آہستہ

اسکی ادا و ناز کی خوبی کوں کر بیاں
ہر خوب رو کوں صورت دیوار کر رہوں

ولی پڑا ہے نظر جب سوں وہ کماں ابرو
ہزار دل سوں ہوا ہوں شکار ناز و ادا

میان معشوق

لکھا ہے صفحۂ ایجاد پر مصور صنع
قلم سے موئے کمر کے نگارِ ناز و ادا

ہیں غم سے گھل سراپا جیوں مو ہوا ہوں لیکن
مجھ ناتواں کی جانب وہ مو کمر نہ آیا

رفتار مستانہ

لگے جوں نخل ماتم سرو گلشن اس کی آنکھوں میں
تماشا جن نے دیکھا ہے سجن تجھ خوش خرامی کا

اے سرو گل اندام اگر نقشِ قدم سوں
بر جا ہے اگر صحن کوں گل پوش کرے توں

اے عقل موشگاف تامل سے کر نگاہ
آتا ہے کس ادا سے وہ نازک میان آج

لیا تعلیم میں ہے آسماں نے   تری رفتار سے طرز تحمّل

ہزاراں لاکھ خوباں میں سجن میرا چلے یوں کر   ستاروں میں چلے جیوں ماہتاب آہستہ آہستہ

ولی اپنے "پیتم پیارے" کے حسن کو ان سے بھی زیادہ حسین تمثیلوں میں بیان کرنا چاہتا ہے باوجود بلندیٔ خیال اور نزاکت تخیل کے وہ اپنی زبان اور تعریف کو ناکافی سمجھتا ہے۔ آخر یوں تعریف کا پہلو نکالتا ہے

تا چند کہوں بات تری خوش شکلی کی   اے شوخ ترے غمزہ نے جو کی سوچلی کی

نہ کر سکوں ترے اک تار زلف کی تعریف   کروں ہزار کتب تجھ ثنا میں گر تصنیف

پھر بھی دل نہیں مانتا اور اسکی ثنائے حسن کیلئے وہ ایک اور نئی راہ نکالتا ہے محبوب کی ایک ایک ادا اور عضو کو شاعرانہ تخلص یا شعریّت کلام سے منسوب کرتا ہے۔ اکثر تخلص ذو معنی ہونے سے نظم میں خاص لطف دے رہے ہیں

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے   نین جامی جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

ریاضی فہم گلشن طبع۔ دانا دل۔ علی فطرت   زباں تیری فصیحی اور سخن تیرا زلالی ہے

نگہ میں فیضی و قدسی سرشت طالب و شیدا   کمال بدر دل اہلی و انکھیاں سو غزالی ہے

تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت   تری ابرو یو تجھ بے دل کوں طغرائے وصالی ہے

ولی تجھ قد و ابرو کا ہوا ہے شوقی و مائل   تو ہر اک بیت عالی اور ہر مصرع خیالی ہے

لیکن اِس پر بھی اسکو تسکین نہیں ہوتی وہ اپنے محبوب کی بارگاہِ حسن میں اس سے بہتر قصیدہ پڑھنا چاہتا ہے لیکن زباں خیال کا ساتھ نہیں دے سکتی جب کچھ کرتے دھرتے بن نہیں پڑتی تو پکار اٹھتا ہے کہ اے حسین تُو تو "مستغنی از اوصاف ہے" یا

صافی ترے جمال کی کاں لگ بیاں کروں   جس پر قدم نگاہ کے اکثر پھسل گئے

سوز و گداز

ولی کے کلام میں سوز و گداز کی فراوانی ہے لیکن اندازِ بیان لطیف اور دلفریب ہے کیونکہ الفاظ کے انتخاب میں اسے کمال حاصل ہے ۔ ایسے جادو بھرے الفاظ ڈھونڈ ڈھونڈ کر لاتا ہے جو کانوں سے گذر کر قلب کی گہرائیوں میں ڈوب جاتے ہیں اور جذبات خوابیدہ کو بیدار کر دیتے ہیں ولی نے جو بھی کہا ہو ہمارا تو اعتقاد یہہ ہے ؎

یہہ سحرِ نگارشِ ولی میں ــــ استاد ہے سحرِ سامری کا

ان اشعار کا سوز و اثر دیکھئے ۔

گلرخوں کے عشق نے جب سوں کیا ہے خوں مجھے ــــ لالہ و گل مجھ سے لیجاتے ہیں رنگ و بوئے درد

گلرخوں کے عشق میں خون ہو جاتا رنگ و بو کا حاصل کرنا تھا ۔ اس خون محبت میں کچھ ایسی بو باس تھی کہ پھول اسکی خوشبو مانگ مانگ کرلے جانے لگے اور لالہ نے وہی رنگ اختیار کرلیا ۔

مضطرِ عشق سوں ہوں مجکوں ملامت نہ کرو ــــ تپشِ دل نے دیا رعشۂ سیماب مجھے

اضطرابِ عشق کا کرشمہ ہے کہ شاعر از سرتاپا سیماب بنا ہوا ہے ۔ کہتا ہے رعشہ بر اندام دیکھکر مجھے کمزور یا بزدل مت سمجھو بلکہ میرے دل کی تڑپ کا اندازہ کرو جسنے میری رگ رگ کو مرتعش کر دیا ۔

اے بادِ صبا باغ میں موہن کے گذر کر ! ــــ مجھ داغ کی اس لالۂ خونیں کو خبر کر

کتنا دلنشین پیرایہ ہے ۔ کلام کا لطف جب آتا ہے کہ شاعر کے خیال کے ساتھ ہمارا تصور بھی کام کرے ۔ اس شعر میں شاعر کی بے بسی اور انتہائی مجبوری ہیں باد صبا سے درد بھری التجائیں قابل دید ہیں یہہ پہلی تمنا یہہ ہے کہ وہ

محبوب کے باغ میں گزر کر جہاں خود اسکی رسائی دشوار ہے۔ دوسری درخواست یہہ ہے کہ "لالہ رنگین" کو اسکے داغ کی خبر کرے تناسبِ الفاظ اور نازک خیالی دیکھئے شاعر کا مطلب یہہ ہے کہ میرا محبوب جو لالۂ رنگین کی طرح حسین اور طناز ہے خود اپنے داغ یعنی میرے وجود سے واقف نہیں ضرورت ہے کہ کوئی اسے بتلائے کہ اسکے آتشِ حسن نے مجھے کسطرح سراپا داغ بنا دیا ہے اسی رنگ کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

اے آہ مرے درد کی توں جا کے خبر کر
کیا درد کسے کون کہے حال مرا جا

خرمنِ ماہ و خوشۂ پروین
خوشہ چینِ جمالِ دلبر ہے

"واہ کیا حسن ہے اللہ رے حسن" مطلب یہہ ہے کہ حسن اور نور محبوب کی ملک ہے چاہے وہ زیادہ ہو یا کم۔ انبار کی حالت میں ہو یا ذرّوں کی شکل میں پس چاند اور عقد ثریا کا نور بھی اسی کا صدقہ ہے اور ان دونوں نے یہہ جمال جہاں آرا اسی "کانِ حسن" سے حاصل کیا ہے

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے
گر نہ دیکھوں تجکوں اے چشم و چراغ زندگی

تنگ و تاریک مکانوں میں رہنے والے شکایت کرتے ہیں کہ "آسمان تک نظر نہیں آتا" کیونکہ آسماں کی وسعت، بلندی اور نیلگوں سطح باعث فرحت و انبساط ہے۔ آسمان کا دیدار آسمانی برکت بن کر نازل ہوتا ہے اور غمگین دلوں کو راحت بخشتا ہے۔ لیکن ولی کہتا ہے کہ تیرے بغیر مجھے خود آسمان خانۂ تنگ و تار نظر آتا ہے کیونکہ "اے چشم و چراغ زندگی" میرا چین تو تجھ سے وابستہ ہے جب تو ہی نہیں تو زندگی میں نور کہاں۔

اسی مضمون کا ایک اور شعر ہے۔

اے نوبہار خوش لقا جب سوں ہوا ہے تو جدا
تب سوں ہے دل کے باغ میں اوّل سوں آخر لگ خزاں

نہ کر تغافل اے مصرِ حسن کے یوسف　　مثال دیدۂ یعقوب ہیں نین تجھ بن

محبوب کو مصرِ حسن کا یوسف کہنے سے شاعر کا مطلب یہہ ہے کہ "میرے مطلوب اور یوسف علیہ السلام میں یہی فرق ہے جو شہر مصر اور مصرِ حسن میں ہے جب حضرت یوسف کی جدائی نے حضرت یعقوب کی آنکھیں سفید کردیں تو مصرحسن کے یوسف کا فراق مجھے کور کردے تو کیا تعجب ہے۔ پس میں اسکی جدائی میں روتے روتے نابینا ہو گیا ہوں اے "ساجن" یہہ وقت رحم کا ہے نہ کہ جفا کا تو اب تو تغافل سے باز آ!۔

ولی کوں اے سجن گا ہے عطا کر بھیک درشن کی!　　دیا ہے لطف سوں تجکوں خدا نے حسن کی دولت

یہہ وہی مضمون ہے جسکو تقریباً ہر شاعر نے باندھا ہے اور طرح طرح سے۔

چند اور اشعار ہیں۔

عشق کے ہاتھ سوں ہوئے دل ریش　　جگ میں کیا بادشاہ کیا درویش

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی!　　کہ دل سوں تاب جی سوں صبر سر سے ہوش لیجاوے

مت جا صنم کہ ہوش دل آیا نہیں ہنوز　　ہیں درد اسکا تجھ کوں سنایا نہیں ہنوز

اک گھڑی تجھ ہجر میں اے دلربا تنہا نہیں　　مونس و دمساز میری آہ ہے فریاد ہے

اے سجن آیا ہوں ہو بے اختیار　　تجکوں اپنا راحتِ جاں بوجھکر

یوں دوستاں کے ہجر میں داغاں ہیں سینے پر ولی　　صحرا کے دامن کے اوپر جیوں نقش پائے رہرواں

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا　　شاید کہ مرا حال اسے یاد نہ آیا

یک بار مسن کے بول نہیں تو حشر تلک　　جیوں برق بے قرار رہینگے کفن میں ہم

خدایا ملا صاحبِ درد کوں　　کہ میرا کہے درد بے درد کوں

شمع مانند جلی اسکی زباں جن نے مجھ سوز کی تقریر کیا
جسے عشق کا تیر کاری لگے اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ ہووے اُسے جگ میں ہرگز قرار جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشق زار کوں پیارے تری بات پیاری لگے

اس ''پیارے تری بات پیاری لگے'' میں سارا فلسفۂ محبت آگیا ہے ان اشعار میں زبان کی سلاست بھی قابل تعریف ہے۔

واردات قلبی

واردات قلبی کی ترجمانی ولی نہایت خوبی سے کرتا ہے۔ آمد بہت زیادہ ہے اور آورد بہت کم۔ اظہار جذبات میں جیسی بے ساختگی ولی میں ہے بہت کم شعرا میں پائی جاتی ہے چونکہ اس کی شاعری خالی برتن کی آواز نہیں اسلئے بے سُری اور بھدّی نہیں ہوتی ولی کے جذبات اشعار ڈھالتے ہیں نہ کہ الفاظ جذبات۔ اسکی ہر جنبش لب اسکی شدید لیکن بے لوث محبت کی ترجمانی کرتی ہے اسکی حیات ہیں نہ سہی لیکن آج اسکا وطن جوہریانِ سخن سے ماشاءاللہ بھرا پڑا ہے اسلئے اسکے معدنِ شاعری کے جواہر نقادانِ سخن کی خدمت میں پیش ہیں تاکہ وہ خود بھی پرکھ لیں اور ایک مایوس شاعر کی حسرت بھی نکل جائے۔

ان غزلوں میں معنی نگاری مضمون آفرینی اور موسیقیت قابل تعریف ہے۔

جس وقت اے سری جن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ جھلک سوں جیوں آفتاب ہوگا

مت جا چمن میں لالن بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کی گُل گُل گلاب ہوگا

مت آئینہ کوں دکھلا اپنا جمال روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا

رکھتا ہے کیوں جفا کوں مجھ پر روا اے ظالم — محشر میں تجھ سوں آخر میرا حساب ہوگا

(۲)

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ — آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

ناز دیتا نہیں گر رخصتِ گلگشتِ چمن — اے چمن زار حیا دل کے گلستان میں آ

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد — طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

عاکم وقت ہے تجھ گھر میں رقیب بدخو دیو مختار ہوا ملک سلیمان ہیں آ

اشعار جذباتِ عشق اور تاثراتِ حسن کی بولتی تصویریں ہیں۔

زبانِ قال نہیں طفلِ اشک کوں لیکن زبانِ حال سوں کرتا ہے عشق کی تقریر

آنسو خود ترجمانِ محبت ہیں۔ لاکھ لاکھ ضبط فغاں کی منہ سے اِلّا اللہ کہا نہ بسم اللہ لیکن عاشق کے آنسوؤں نے بھانڈا پھوڑا اور عشق کا کچا چٹھا بیان کر دیا۔

نہ پوچھو عشق میں جوش و خروشِ دل کی ماہیت برنگِ ابر دریا بار ہے رومال عاشق کا

عشق میں شدتِ گریہ نے عاشق کے رومال کو ایسی کرامت بخشی کہ انبیاء کے معجزے بھی مات کھا گئے چشم عاشق دریا بہا رہی ہے۔ اسی مضمون کو کچھ تبدیلی کے ساتھ دوسرے دور میں دیکھئے ؎

ہمارے دیدۂ گریاں سے ابرِ تر کو کیا نسبت ! وہ اک جھالے میں تھم جاتا ہے یہ برسوں برستے ہیں

مرادل کرکے مجھ سے بے وفائی پسند خاطر خوباں ہوا ہے

ولی کا یہ شعر آج تک زبان زد خاص و عام ہے دو صدی پہلے کے کلام کا اسقدر مقبول ہونا کہ باوجود دوسو سال کی تبدیلیوں اور ترقیوں کے لوگوں کی زبانوں پر چڑھا رہے حیرت انگیز ہے۔

محبوب کی گلی کا مرتبہ محب کی نگاہ میں۔

جنت میں کب دئیے ہیں وہ رضواں کوں مرتبہ جو مرتبہ ہے تیری گلی کے مقیم کا

کہو زاہد سے جاوے اس گلی میں اگر مشتاق فردوس بریں ہے

ڈیڑھ صدی بعد کا ایک شاعر کہتا ہے۔

جنت میں مجھکو اسکی گلی سے ہیں لیچلے ‏ کیا جانئے کہ مجھ سے ہوا آہ کیا گناہ

دلِ بیتاب کہ اک آن نہیں اسکوں قرار ‏ زلف دلدار سے ہمسر ہے پریشانی میں

یہہ استاد اوّل کی استادی ہے کہ اپنے محبوب کی زلف کی تعریف کا پہلو یوں نکالا کہ جسطرح میرا دل پڑا تڑپا کرتا ہے اسی طرح اسکی سیاہ کاکلیں اسکے رخساروں پر لوٹا کرتی ہیں (اور یقیناً حسن کا مظاہرہ کرتی ہیں) اب چونکہ دونوں بے چین ہیں "پریشانی" وجہہ تشبیہہ ٹھیری۔ دلِ مضطر کے بخت جاگے اور زلف محبوب سے "ہمسر" ہونے کا موقع ہاتھہ آیا ولی کا قلم کہیں جادو جگاتا ہے تو کہیں نصیب ان اشعار کی بے ساختگی و صداقت ملاحظہ ہو۔

عزیزاں بعد مرنے کے نہ بوجھو تم کے تنہا ہوں ‏ لکھیا ہوں پردۂ دل پر خیال اس یار جانی کا

شرابِ جلوۂ ساقی سوں مت کر منع اے زاہد ‏ یہی ہے مقتضا عالم میں ہنگامِ جوانی کا

دریا میں بیم کے یاں گرداں ہے کشتیٔ عقل ‏ اس موج شعلہ زن میں کیا آسرا ہے خس کا

عاشق زار سمجھ مجھ سوں ہوا ہے بے زار ‏ نقد دل دیکے میں دلدار کوں دلگیر ہوا

نزاکتِ خیال اور مضمون آفرینی

ولی کے تخیل کی ایک نمایاں خصوصیت یہہ بھی ہے وہ نزاکت پسند ہے ۔ اسنے بار بار اپنی معنی نگاری کو سراہا ہے مثلاً

ولی انکھیاں کی کرواوات پتلی کی سیاہی سوں لکھیا تیری صفت کوں بے قلم معنی نگاری کا

اسمیں کوئی شک نہیں کہ اسکے اشعار الفاظ کی بھول بھلیاں نہیں ہوتے وہ معنی اور مطالب پر زور دیتا ہے اور اکثر متناسب الفاظ اور زور تخیل سے بات میں بات پیدا کرتا جاتا ہے لیکن اسکے کامیاب شاعر ہونے کی ایک وجہہ یہہ بھی ہے کہ وہ نزاکت پرست ہے ۔ لطیف استعارے ۔ نازک تشبیہیں میٹھے الفاظ اور حسین ترکیبیں اسکی کامیابی کا راز ہیں ۔ اسی طرح مضمون آفرینی بھی اسکی ایک خصوصیت ہے ۔ وہ ہر چیز کے معنوی پہلو پر غور کرتا اور نزاکت خیال کی بدولت نئے نئے مضامین پیدا کرتا ہے چند اشعار نمونتاً ثمرف نظر ہیں جن میں مضمون آفرینی یا جدت خیال داد طلب ہے ۔

توں سر سوں قدم تلک جھلک میں گویا ہے قصیدہ انوری کا

یہہ عمزہ شوخ ساحری میں استاد ہے سحر سامری کا

ولی کے یہہ مشہور شعر ہیں ۔ دونوں میں جدت خیال قابل ستائش ہے ۔ محبوب کو آن بان سج دھج میں انوری کے قصیدے سے تشبیہ دینا بالکل نئی چیز ہے ۔ اسی طرح خوبرویان شوخ و شنگ کے غمزہ و ادا کو سحر ۔ جادو ۔ منتر اور افسوں تو کہتے اور سنتے آئے ہیں لیکن جسطرح ولی کا ساجن سورج ۔ چاند

ستاروں۔ قوس قزح خوشہ پرویں اور کہکشاں وغیرہ کو حسن اور نور عطا کرتا ہے اسی طرح اسکی ناز و ادا سحر ہی نہیں بلکہ سحر سامری (وہ مشہور ساحر و کاہن جو عہد حضرت موسےٰ میں اپنے جادو کے سبب سے ملک الموت کی طرح بدنام تھے اور فرعون کے حکم سے حضرت موسےٰ کا مقابلہ کیا تھا سامری کہلاتے تھے) کی استاد ہے۔ صرف دنیا کے عشوہ گروں ہی نے اس سے افسوں نہیں سیکھا خود سامری بھی اسکے شاگرد ہیں۔

اعجاز حسن دیکھ کہ وہ روئے با عرق پیدا کیا ہے چشمۂ آتش سوں آب آج

دوست کے چہرے کو چشمۂ آتش سے اور عرق رخ کو آب سے تشبیہہ دیکر یہہ کہنا کہ یہہ سب حسن کا اعجاز ہے جو چشمۂ آتش بجائے آگ کے خلاف آب ہے کتنا لطیف پیرایہ اور نازک خیالی ہے۔

ناز دیتا نہیں گر رخصت گلگشت چمن اے چمن زار حیا دل کے گلستاں میں آ

شاعرانہ مصوری اسکو کہتے ہیں کہ ایک ایک لفظ دل میں اترتا چلا جائے الفاظ کی موسیقیت نے شعر کا حسن دوبالا کر دیا ہے چمن گلستاں کا چھوٹا سا حصہ ہوتا ہے محبوب کو "چمن زار حیا" کہکر اپنے دل کے گلستاں میں آنے کی دعوت دینا کیسا خوبصورت مضمون ہے۔ کہتا ہے کہ اے "مجسمۂ ناز و ادا" اگر تو ناز کے مارے گلگشت چمن سے عاجز ہے تو میرے دل کے گلستاں میں آجا جو تیرے لئے ہر طرح موزوں ہے ورنہ چمن کی کیا ہستی کہ تجھ سے جو بجائے خود ایک چمن زار حیا ہے سرفراز ہو۔

ہزار بلبل مسکیں کا صید ہے باقی مقیم ہے چمن حسن میں بہار ہنوز

یہہ تو سب جانتے ہیں کہ موسم گل بلبلوں کیلئے پیام اجل لاتا ہے۔ جبتک بہار رہتی ہے غریبوں پر نت نئے ستم ٹوٹتے ہیں۔ صدہا باغبان کی گولیوں کا نشانہ اور ہزارہا صیاد کے دام اجل میں گرفتار ہوتے ہیں۔ پھر بے نیازیٔ معشوق الگ جان لیوا ہوتی ہے۔ شاعر کے انداز تکلم سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے بھی ہزارہا

گرفتار دام حسن ہو چکے ہیں اور ابھی ہزار ہا ہونے باقی ہیں کیونکہ اسکے چمن حسن میں بہار باقی ہے۔ ہزاروں پھڑک رہے ہیں اور ابھی ہزار ”بلبل مسکیں“ کو اپنی زندگی بے رحم صیاد کے دام حسن میں تڑپ تڑپ کر گذارنی ہے

نہیں یہ خط بہ گرد لعل مئے نوش ہوا ہے چشمۂ خورشید خس پوش

ندرت خیال تحسین طلب ہے شاعر کہتا ہے کہ وہ لب لعلیں ایسے تابناک ہیں کہ ”چشمۂ خورشید کا دھوکا ہوتا ہے اور اسکے گرد خط کی سبزی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ”چشمۂ آفتاب“ کے گرد خس اُگ آئی ہو۔ خط میں جہاں رنگ روپ وجہہ تشبیہہ ہیں وہاں بوئے خس بھی مراد ہے۔ یعنی اس میں ایسی خوشبو ہے جو مشام جان کو مہکائے رکھتی ہے۔

ماہ کے سینے اوپر اے ماہ رُو! داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا

چاند میں داغ کون نہیں دیکھتا اور کتنی توجیہیں بیان نہیں کی جاتیں۔ کوئی کہتا ہے کہ زمین کا عکس ہے کوئی کہتا ہے اسکے اپنے غار پہاڑ اور درخت ہیں۔ بڑی بوڑھیاں چرخے والی بڑھیا کی کہانی سناتی ہیں بقول

فکر ہر کس بقدر ہمت اوست

ولی ایک نئی توجیہہ کرتا ہے۔ دکنی مثل ہے جو من میں بسے سو سپنے میں دسے۔ اسکے پریم کے سپنے میں چاند کے داغ۔ داغِ رشک نظر آتے ہیں جو اسکے محبوب کے حسن کی ”جھلکار“ دیکھکر اسکے سینے میں پڑ گئے

دریا میں پریم کے یاں گرداں ہے کشتیٔ عقل اس موجِ شعلہ زن میں کیا آسرا ہے خس کا

ولی کے ہاں زیادہ تر صنعت مراعات النظیر ہے اور متذکرہ بالا شعر اسکی ایک اچھی مثال ہے۔ مثل ہے کہ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ شاعر کہتا ہے کہ محبت کے طوفان خیز سمندر میں کشتیٔ عقل بھی چکر کھاتی ہے۔ عشق کے آگے عقل کی وہی بساط ہے جو موج شعلہ زن کے آگے تنکے کی۔ بس پریم کے سمندر میں

غرق ہونے والوں کو عقل بھی نہیں بچا سکتی ۔

معشوق کوں ضرر نہیں عاشق کی آہ سوں بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سوں چراغِ گل

جسطرح بادِ صبا کے روح پرور جھونکے غنچہ کو بجائے نقصان کے فائدہ بخشتے ہیں اور غنچہ کو گل بنادیتے ہیں اسیطرح محبوب کو محب کی آہیں نقصان نہیں پہونچا سکتیں بلکہ اسکے پھولنے پھلنے کا باعث ہوتی ہیں ۔

دیکھکر تجھ مکھ کے پرتو کوں اے رشک آفتاب موج کے پانی نے ڈالی پگ میں زنجیر طلا

ندرت خیال دیکھئے محبوب تو رشک آفتاب اور چشمۂ آفتاب ٹھیرا اسکا پرتو بھی اتنا روشن ہے (اگرچہ سایہ سیاہ ہوتا ہے) کہ سمندر کا پانی طلائی ہوگیا شاعر کہتا ہے کہ یہ سنہری لہریں جو موجوں میں پیدا ہورہی ہیں حقیقت میں طلائی زنجیریں ہیں ۔ تیرا عکسِ رخ اتنا نظر فریب ہے کہ موجوں نے بھی اس خیال سے کہ کہیں پانی کے رو میں ادھر اُدھر نہ ہوجائیں اور تیری پرچھائیں سے محروم رہجائیں طلائی زنجیریں پہن لیں اور تیرے دیدار کی خاطر پاؤں باندھ کر بیٹھ رہیں ۔

دل کو گر مرتبہ ہے درپن کا مفت ہے دیکھنا سری جن کا

یہہ شعر ذو معنی ہے ۔ معرفت میں لیجئے تو مطلب یہہ ہوگا کہ اگر دل پاک ہو اور غبار حرص دنیا سے آئینہ کی طرح صاف ہو تو انوار الٰہی کا مظہر بن جاتا ہے ۔ پس جمال شاہد حقیقی کیلئے دل کی طہارت درکار ہے ۔

دوسرا مطلب یہہ ہے کہ اگر محب محبوب کے تصور میں اتنا محو رہے کہ اسکی تصویر آئینۂ دل میں کھچ آئے تو پھر ہر وقت دیدار ہی دیدار ہے ؎

دل کے آئینے میں ہے تصویر یار ! جب ذرا گردن جھکائی دیکھ لی

ولی گریۂ عشاق سوں خنداں ہے باغِ بزم حسن مغز پروانہ سوں روشن ہے چراغ بزم حسن

مضمون صاف ہے لیکن دو صدی قبل یہہ انداز بیان ولی کی کرامت نہیں تو کیا ہے حسن کی گرم بازاری عشاق کی

ہائے ہُو سے ہے اور جان بار پروانوں کی بدولت بزم حسن کا چراغ فروزاں ہے

ہند وئے زلف پری رو ہے پریشانی فروش   بیچ دیوے مجکوں سودے ہیں اگر سودا کروں

زلفیں پریشانی فروش ہیں ظاہر ہے کہ کسی جنس کا بیچنے والا اسکے خریدنے کی فکر میں بھی لگا رہتا ہے۔ یہاں سودے سے مراد جنون اور پریشانی ہے شاعر کہتا ہے کہ زلف محبوب جو پریشانی کا لین دین کرتی ہے اگر مجھے پریشاں دیکھ لے تو مجھے بھی کسی گاہک کے ہاتھ بیچ ڈالے اسلئے اس کافر کے ڈر سے وہم بخود ہوں ورنہ مجھ سودائی کا سودا قابل دید ہوتا

عاشقاں اس آتشی رخسار کے چہرے اوپر   پیچ و تاب زلف ہے دود چراغ بزم حسن

آتشیں رخسار۔ پیچ و تاب زلف۔ چراغ بزم حسن کی فصاحت اور حسن کو دیکھکر کون ہے جو ولی کی قادرالکلامی کا اعتراف نہ کرے۔ محبوب کے رخساروں کی سرخی کو آتش اور کاکل کی سیاہی اور لہرانے کو پیچ و تاب چراغ بزم حسن کہنا خود اسکے زور تخیل کی دلیل ہے۔ غرض کلام ولی۔ ندرت خیال اور جدت تخیل سے بھرا پڑا ہے۔ چند اور اشعار ہدیۂ ناظرین کرکے ہم اس موضوع کو ختم کرتے ہیں۔

جو کوئی دیکھے چشم گریاں   اسے ابر بہاراں یاد آوے
نہ بھول گرم نگاہی پہ شوخ چشموں کی   محبت انکی ہے وہو کا سراب کی مانند
مرے دل کوں کیا بیخود تری آنکھوں نے اے ظالم   کہ جیوں بے ہوش کرتی ہے شراب آہستہ آہستہ

ان اشعار میں سلاست کے ساتھ صداقت بیان بھی قابل تعریف ہے۔

راہ مضمون تازہ بند نہیں !   تاقیامت کھلا ہے باب سخن
لفظ رنگیں ہے مطلع رنگین   اور معنی ہے آفتاب سخن
عرفی و انوری و خاقانی   مجکوں دیتے ہیں سب جواب سخن

ولیؔ کی معلومات

کسی شاعر کے تخیل کے بنانے میں اسکی ذاتی معلومات اور مشاہدات کو بھی بڑا دخل ہوتا ہے۔ ولیؔ کے کلام کو بہ نظر غور دیکھنے والے جانتے ہیں کہ اس میں اکثر اشعار ایسے ملتے ہیں جن سے اسکی علمی معلومات پر روشنی پڑتی ہے۔ اسکے ہاں آیاتِ قرآنی۔ احادیثِ قدسی۔ اسلامی اور ہندی تلمیحات اور دوسرے عالمانہ مضامین کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ آزادؔ لکھتے ہیں کہ "انکی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے۔" دوسرے تذکرہ نویسوں نے یا تو انہیں معمولی شُد بُد جاننے والا لکھا ہے یا سرے سے چپ ہی سادہ لی ہے۔ ایک اعتراض ولیؔ پر یہہ کیا جاتا ہے کہ وہ علم عروض سے واقف نہ تھے انکے کلام میں اکثر سکتہ ہے یا غلط تلفظ نظم ہوا ہے لیکن اس اعتراض کی اہمیت ذرا سے غور کے بعد جاتی رہتی ہے۔ آج سے دو سو سال پہلے کے تلفظ اور آج کے تلفظ میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ عہد ولی میں ماضی فعلوں کا تلفظ یا کی خفیف آواز کے ساتھ کیا جاتا تھا جیسے چلیا۔ کھلیا۔ سٹیا۔ لکھیا وغیرہ۔ اگر ہم ان افعال کا تلفظ موجودہ تلفظ کے مطابق کریں تو یقینی شعر کا وزن بگڑ جائیگا۔ اسی طرح بہت سے الفاظ کا تلفظ اگر اُس زمانے کے موافق نہ کیا جائے تو وزن باقی نہیں رہتا۔ جیسے نَیَن۔ حیَرن۔ بیَم۔ پرِیتؔ۔ منَین۔ انجھواں وغیرہ۔ اکثر الفاظ کو وہ اپنے زمانہ کے تلفظ کے مطابق بیک حرکت باندھتے ہیں۔ مثلاً کوئی۔ خیال۔ وغیرہ ولیؔ کی کوئی غزل مقررہ اوزان سے باہر نہیں اور تقریباً ہر بحر میں اُسنے غزلیں کہی ہیں یہہ اسکی قابلیت اور قادر الکلامی کی عین دلیل ہے۔

یہہ خیال بھی کہ ولی کی علمیت بالکل سطحی تھی صرف تخیل نے شاعر بنا دیا تھا قرین انصاف نہیں کیونکہ تخیل کا زور اور طبیعت کی موزونیت شاعر ضرور بنا سکتی ہے۔ عالم نہیں بنا سکتی۔ شاعری خود ایک آئینہ ہے جسمیں شاعر کے تاثرات۔ جذبات۔ خیالات اور علمی معلومات ہر چیز کا پتہ چل جاتا ہے۔ ولی کے ہاں ایسے علمی مضامین پائے جاتے ہیں جو ایک قابل دماغ ہی کی پیداوار ہو سکتے ہیں۔ اکثر علوم متداولہ کی کتابوں کے نام ملتے ہیں اور معلوم ہوتا ہے کہ اسنے انکا بغور مطالعہ کیا ہے اکثر شاعران ایران و ہندوستان کے نام ملتے ہیں اور یہہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اسنے انکو دیکھا ہے۔ غرض ولی کا کلام خود ظاہر کر رہا ہے کہ میں ایک ترقی یافتہ دل و دماغ کی مخلوق ہوں۔ علم و کمال کا حصول قوت اکتساب اور انسان کی دماغی طاقتوں پر منحصر ہے۔ لیکن علوم روحانی تو تمام و کمال وہبی ہوتے ہیں۔

رموزِ علم اویسی بود ذوقی نہ تدریسی　　　چہ داند ذوق ابلیسی رموزِ علم الاسماء

اس لئے کیا ضرور ہے کہ علمیت کے لئے کسی سند کی ضرورت ہی ہو یگانۂ روزگار درسگاہوں میں تعلیم پاکر کسی مایۂ ناز معلم سے سبق لیکر بھی بعض طالب علم کورے ہی نکلتے ہیں انکو حقیقی علم سے اتنا بھی لگاؤ نہیں ہوتا جتنا اڈ پر سفیدی۔ اور بعض علم کے سچے طالب ایسے بھی گزرے ہیں کہ جنھیں نہ اچھی درسگاہیں ہی مل سکیں نہ سرمایہ افتخار اسناد لیکن باوجود اس کے وہ ایسے صاحب کمال ہوئے ہیں کہ کوئی صاحب عقل سلیم انکے علم و فضل سے انکار ہی نہیں کر سکتا۔

ولی کے کلام کو جانچنے کے بعد نقاد کا اس نتیجہ پر پہونچنا لازمی ہے کہ وہ اپنے وقت کا عالم تھا چاہے اسنے کسی معلم سے درس لیا ہو یا نہیں اسکا مطالعہ بھی وسیع تھا۔ اسکے کلام کو پیش نظر رکھتے ہوئے

ہمیں اس بات کو ماننا پڑیگا کہ وہ برسوں علمی صحبت میں رہا ہے۔

وہ ایک عالی دماغ شاعر کی طرح الفاظ کے ہیر پھیر سے زیادہ معنی نگاری کو اہمیت دیتا ہے۔ لفاظی اسکو پسند نہیں چنانچہ کس لطف سے اپنی معنی نگاری کا اظہار کیا ہے ؎

گرچہ پابند لفظ ہوں لیکن دل مرا عاشق معانی ہے
معنی کے جو چمن میں ہے بلبل معانی تجھ گلبدن کے دیکھے رنگیں خیال ہوگا
حکمت و منطق و معانی پر مشتمل ہے کمال تجھ لب کا

یہہ موضوع ہمارے عنوان سے باہر ہے ورنہ ہم ولی کی معلومات سے متعلق تفصیل سے آیاتِ قرآنی، احادیث نبویؐ، ضرب الامثال، اسماء کتب متداولہ، شعرا کے نام، اسلامی ادب و تلمیحات اور ہندی تلمیحات وغیرہ کی مثالیں اسکے کلام میں سے منتخب کرکے یہاں پیش کرتے۔ اس بحث سے ہمارا مقصد صرف یہہ تھا کہ یہہ بتادیا جائے کہ ولی کے تخیل کے بنانے میں اسکے علم و فضل کا بھی بڑا حصہ ہے۔

ایسے اشعار سے قطع نظر کرکے جن میں محض علمی مباحث ہیں یا ایسی تلمیحیں ہیں جو ولی کی وسعت معلومات کا پتہ دیتی ہیں ہم یہاں چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں جن میں علاوہ حسن کلام کے کوئی نہ کوئی علمی پہلو موجود ہے۔ یا ایسے نکات ہیں جو کسی امیّ شاعر کی فہم و ذکا میں آہی نہیں سکتے۔

کیا اک بات میں واقف مجھے راز نہانی کا رکھوں غنچہ اوپر حرف اس دہن کی نکتہ دانی کا

میں نے محبوب میں ایک بات ایسی پائی جس نے مجھے چھپے ہوئے بھید سے واقف کردیا۔ غنچہ دہن محبوب کی طرح نکتہ داں نہیں پس مجھے حق ہے کہ غنچہ کو اس دہن نازک کے راز سے آگاہ کرکے اسکو ذلیل کروں۔ دہن محبوب ہمیشہ بند رہتا ہے کبھی کھلنا نہیں جانتا لیکن غنچہ چٹکا کرتا ہے اس سے پتہ چلا کہ دہن محبوب ایک ایسا نکتہ ہے جو

تقسیم نہیں ہوسکتا۔ نظر نہیں آسکتا غنچہ چٹکتا بھی ہے اور کھلتا بھی۔

نہ پوچھو کیوں ہوا ہے کم سخن وہ دلبر رنگیں لب تصویر پر ہے رنگ دائم لاجوابی کا

جب اُس نے اپنی حسین تصویر دیکھی تو ہر بات میں اپنا ثانی پا یا الا اسکے کہ اسکے (تصویر کے) لب خاموش تھے اور خود بولتا تھا۔ جب اسنے اسطرح اپنی لاجوابی میں فرق آتے دیکھا تو چپ سادھ لی تاکہ تصویر والی لاجوابی خود اس کے لبوں پر بھی صادق آئے اور اصل اور نقل میں کوئی امتیاز باقی نہ رہے۔

کتابت بھیجنی ہی شمع بزم دل کوں ہے کانپ پر پروانہ او پر لکھ سخن مجھ جانفشانی کا

شاعر کہتا ہے کہ میری جانفشانی کا حال لکھنے کیلئے سوائے پر پروانہ کے اور کوئی چیز موزوں نہیں۔ کیونکہ پروانہ وہ سوختۂ آتشِ حسن ہے جو خود جل مرتا ہے اور اپنے سوز دل کی یادگار پر چھوڑ جاتا ہے۔ اسی کی طرح میں بھی جاں نثار شمع بزم دل ہوں۔ چاہئے کہ میری داستانِ جاں سپاری بھی پر پروانہ پر رقم ہو تاکہ جب وہ وہاں اور میں یہاں جل مریں تو دونوں کی داستان محبت پر پروانہ سے باقی رہجائے۔

ہوا ہے گرم تو جب آفتاب کے مانند کیا ہے ہوش نے پرواز آب کے مانند

شعر کا مطلب صاف ہے صرف بتلانا منظور ہے کہ یہہ شعر غالب کے اس شعر سے ٹکراتا ہے ؎

ضعف سے گریہ مبدّل بہ دمِ سرد ہوا باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

گو مضمون وہی ایک چیز "پانی کا ہوا ہو جانا" ہے لیکن دونوں کی شانِ بیان اور سلاست زبان۔ روانی اور بے ساختہ پن ملا کر دیکھ لیجئے۔ ہر منصف مزاج کو کہنا پڑیگا کہ ولی کی سلاستِ بیان غالب سے بڑھی ہوئی اور غالب کی تمثیل ولی سے نزاکت خیال میں گھٹی ہوئی ہے۔

جگ میں جو اعتبار نہ پایا ترے قریں کی منفعل ہو مہر نے چرخ کہن میں جا

شعر کی خوبی میں "مہر" کے ذو معنی لفظ نے چار چاند لگا دئے ہیں مطلب یہہ ہے کہ تو حسین بھی ہے اور نوخیز بھی بھلا آفتاب کو تجھ سے کیا نسبت۔ جب اسنے دیکھا کہ تیرے آگے اسکے حسن کا بازار سرد پڑ گیا تو اسنے مارے شرم کے آسمان کہن میں سکونت اختیار کی جو بلحاظ سن وسال اسکے لئے موزوں تھا یا محبت کے معنی لیجئے تو ایک بلیغ اشارہ یہہ ہے کہ تجھ میں اور محبت میں اتنا ہی بعد ہے جتنا زمین و آسمان میں۔

مژہ بتونکی ہے تجھ غم میں خواب مخمل سرخ لگے ہیں ترک کے بھالے کوں یا مسلسل سرخ

کہتا ہے کہ اے حسن کے دیوتا خوبرویوں کی پلکیں تیرے عشق میں روتے روتے خون بہانے لگیں اور انکی پلکوں پر جو قطرات خوں جمے ہوئے ہیں ان پر سرخ مخمل کے خواب کا دھوکا ہوتا ہے یعنی وہ اس طرح بچھے ہیں جیسے ست خواب مخمل یا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کے نیزوں پر سرخ غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔

(مسلسل غلاف سنان کو کہتے ہیں جو ہندہ کا اور چکنا ہوتا ہے تاکہ نیزہ زنگ سے بچا رہے)

ہر رات زلف سے جو مطول کی بحث تھی تیرے دہن کوں دیکھ سخن مختصر کیا

کتاب مطول کی تلمیح کے قطع نظر چار قسم کی راتیں مطول سمجھی جاتی ہیں۔ جاڑے کی راتیں۔ شب دیجور جو سال میں ایک بار آتی ہے۔ شب ہجر جسکی طوالت کی داستانوں سے شاعروں کے دیوان بھرے ہیں۔ چوتھے شب انتظار جسکے لئے کہا گیا الاِنتِظَارُ اَشَدُّ مِنَ المَوتِ ہر رات سوچنے والے سوچا کرتے کہ ع "زلف دراز یار کو کیا نام دیجئے" کوئی کہتا یہ تو شب سرما ہے کوئی کہتا نہیں سیاہ بھی تو ہے شب دیجور کہو۔ کوئی شب ہجر سے مثال دیتا اور کوئی شب انتظار سے کوئی تشبیہہ ٹھیک نہ اترتی تھی جو زلف پر پھب سکتی اس بحث نے بہت طول کھینچا لیکن خدا بھلا کرے غنچہ دہن کا جس کی نزاکت نے سب کے دل موہ لئے اور اب اختصار کی باتیں ہونے لگیں۔ مثلاً کسی نے کہا ہوگا غنچہ ہے کسی نے کہا لفظ ہے۔ کوئی کہتا تھا نکتہ ہے اور کسی من چلے نے تو یہ بھی کہدیا کہ ہے ہی نہیں۔

صنم کے لعل پر وقتِ تکلّم — رگ یاقوت ہے موجِ تبسم

اس کی خوبی بیان سے باہر ہے حقیقت یہہ ہے کہ ولی کے سحر کار قلم نے عرفی کے اس شعر کو نظروں سے گرا دیا ؎

خندہ بر جوہر فرد است دلیل تقسیم ! — گر بہ بازیچہ شوم ملزم ارباب کلام

جسم جوہر میں ایک نقطہ ہوتا ہے جسکو جسم جوہر کا ایک جز کہئے جہاں رنگ شعاعی قرار پاتا ہے۔ شاعر اس نقطۂ رنگ شعاعی کو رگ یاقوت کہتا ہے اور اس "رگ یاقوت" کو اپنے ساجن کی مسکراہٹ سے تشبیہ دیتا ہے اور اسکے لب لعلیں کو لعل سے تمثیل دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ جسطرح رگ یاقوت پر رنگ قرار پاکر جسم جوہر میں دوڑ جاتا ہے بالکل اسی طرح جب میرا ساجن بولتا ہے تو (چونکہ ہنس مکھ ہے) مسکراتا ہے اسکے تبسم کی دلفریب رو اسکے لب لعلین پر دوڑ جاتی ہے اور جسطرح جسم جواہر رگ یاقوت سے اخذ رنگ کرتا ہے میرے محبوب کا چہرہ مہرہ خط و خال لب اس لطیف موج تبسم میں ڈوب جاتے ہیں۔

(اس حسین خیال کے سمجھنے کیلئے تخیل کی ضرورت ہے)

غرض کہانتک ایک ایک شعر کی تشریح کیجائے کلام ولی جواہر پاروں سے لبریز ہے۔ یہ قابل غور ہے کہ آج سے دو سو سال پہلے ولی کے قلم میں یہ جادو کہاں سے آیا تھا جو آجتک دلوں کو مسحور کر رہا ہے۔ اس شعر میں اسنے حسن دوست کے اعجاز کو دکھایا ہے

اعجاز حسن دیکھ کہ وہ روئے با عرق — پیدا کیا ہے چشمۂ آتش سے آب آج

اور مثالیں

ہر زرہ اسکی چشم میں لبریز نور ہے — دیکھا ہے جس نے حسنِ تجلی بہار کا

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اسکوں — کرتی ہے نگہ جس قد نازک پہ گرانی

آج ہر گل نور کا فانوس ہے — کوہ و صحرا صورت طاؤس ہے

کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے — دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نئیں

صرف کرتا ہے ولی عالم نہیں نقاش صنع — عیش کی تصویر میں رنگ فراغ بزم حسن

حسن تیرا عالم علوی سوں دیتا ہی خبر — یہ دم عیسےٰ کی تیرے لب نہیں تاثیر ہے

معتقدات

معلومات ومشاہدات کی طرح ولی کے معتقدات نے بھی اسکے تخیل کے ارتقا میں خاص حصہ لیا ہے۔ وہ اپنے تاثرات کے لحاظ سے ایک عارف کامل اور صوفئ صافی ہے۔ اسکے سازِ روح کا تار تار مضراب معرفت سے مرتعش ہے اسکے خرمن تخیل میں عرفان و تصوف کی بجلیاں تڑپتی نظر آتی ہیں اور اسکی دنیائے شاعری میں عشق حقیقی کا طوفانی سمندر کروٹیں لیتا دکھائی دیتا ہے دکن کا وہ دور جسمیں ولی نے جنم لیا وہ ماحول جس میں ولی کے وجدان نے نشو نما پائی اور وہ سوسائٹی جس میں ولی کے تخیل نے ارتقا کے منازل طے کئے۔ خاص تصوف کا دور تھا۔ چنانچہ ولی کے ان اشعار سے اس دور کی ذہنیت اور رجحان پر روشنی پڑتی ہے۔

مجھے بولیا کہ توں واقف نہیں عشق حقیقی سوں　　تو بہتر یوں ہے جا دامن پکڑ عشق مجازی کا
سنیا ہوں جب سوں بولتا ولی شیریں سخن سینے　　لگیا ہے تب سوں شیوہ جی کوں میرے عشق بازی کا

شغل بہتر ہے عشق بازی کا　　کیا حقیقی و کیا مجازی کا

ولی جن نے نہ باندھیا دل کوں اپنے نونہالاں سوں　　نہ پایا ان نے پھل ہرگز جہاں میں زندگانی کا
جو پی کے نام پاک پہ جی سوں فدا نہیں!　　راضی کسی طرح ستی اس سوں خدا نہیں
دیکھا ہے اک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں　　جب بے خودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

یہہ صرف مولانا شبلی کا خیال نہیں بلکہ ایک مسلمہ نظریہ ہے کہ ہر قوم کا دور زوال دور تصوف ہوتا ہے۔ ستم دیدہ شاعر اپنی قومی تباہی سے خاص طور پر متاثر ہوتا ہے۔ وہ عالم کرب و اضطراب میں اپنے درد کا درماں اشراق و تصوف میں ڈھونڈتا ہے۔ قوم کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے ایک طرف تو قوم کے مجروح جذبات کا اظہار اپنے درد بھرے

کلام سے کرتا ہے اور دوسری طرف اپنے پیام سکون انجام سے قوم کے زخمی دل پر تسلیم و رضا کا مرہم لگاتا ہے۔ دکن کے اس معجز بیاں شاعر نے ابھی ہوش بھی نہ سنبھالا تھا کہ دکنی سلطنتیں تباہ و تاراج ہو گئیں۔ ملک برباد اور قومی خزانے نذر اغیار ہو گئے پھر اس سات آٹھ سال کے بچے نے گولکنڈہ کے فقیر منش تاجدار کو اپنے ہی مسکن میں قیدی کی حیثیت سے پایا۔ اور یقیناً اس فرشتہ خصال ہر دلعزیز فرمانروا کی بدبختی پر اپنوں اور بیگانوں کو خون کے آنسو بہاتے بھی دیکھا ہو گا ایک حساس اور وطن پرست دل ہی ان دردناک جانکاہ حالات کا اندازہ کر سکتا ہے

انیسؔ ~ مالک سے بھرے گھر کے اجڑ جانے کو پوچھو گھر والوں سے یہ تفرقہ پڑ جانے کو پوچھو

یہی وجہ تھی جسنے تصوف کے اس ہلکے رنگ کو جو وجہیؔ کی تحریروں میں جھلکتا ہے ولیؔ کے ہاں بہت گہرا کر دیا۔

صوفیائے کرام کا اصولی اعتقاد ہے کہ عشق مجازی عشق حقیقی کی سیڑھی ہے اور بغیر اس نردبانِ مجاز کے بام حقیقت تک پہونچنا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ ولیؔ نے چونکہ صوفیائے کرام سے استفادہ کیا تھا لازمی تھا کہ اسپر بھی وہ رنگ غالب رہتا چنانچہ اسکا عقیدہ ہے کہ جویائے حقیقت کا عشق بوالہوسی نہیں بلکہ ~

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

پھر اس "عجب فن" کا فلسفہ ولیؔ کی زبان سے سنئے ~

عشق بےتاب جاں گدازی ہے حسن مشتاق دل نوازی ہے
عشق خونیں سوں جو کیا ہے وضو مذہب عشق میں نمازی ہے
جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ وہ زمانے کا فخر رازی ہے
پاک بازوں سے یہ ہوا معلوم عشق مضمونِ پاک بازی ہے

ممکن ہے کہ اس طریق نے عوام الناس کی جو فلسفۂ عرفاں کی گہرائیوں سے ناآشنا ہوتے ہیں غلط رہبری کی ہو۔

امرد پرستی کی مذموم بنا ڈالی ہو بہیمانہ جذبات کو بھڑکایا ہو۔ اچھی سوسائٹی کو بگاڑا اور بری سوسائٹی کو بنایا ہو لیکن اس سے مسلک تصوف کے پاک اور بے لوث اصول پر حرف نہیں آسکتا۔ نہ اس سے انکار ہو سکتا ہے کہ یہی وہ مئے دو آتشہ تھی جسنے ولی کے تخیل میں آگ لگادی۔ دنیا کی سدھ بدھ کھوئی اور تجلی معرفت بخشی۔ ارباب زر کی خوشامد اور صاحبانِ اثر کی چاپلوسی سے بے نیاز کردیا۔ اسی نے اسکی شاعری میں جان ڈالی اور اس کے کلام کو سوز و گداز سے بھر دیا۔

ولی اپنے عشق و عاشقی کی تفسیر اپنی ہی زبان سے یوں کرتا ہے۔

اے ولی عشق ظاہری کا سبب جلوۂ شاہد مجازی ہے
تواضع خاکساری ہے ہماری سرفرازی ہے حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے

مسلک تصوف کی کیسی جامع تعریف ہے جو ولی نے اپنے اس ایک شعر میں کی ہے۔ یہی تو وہ قادر الکلامی ہے جو صاحبانِ ذوق سلیم سے آج تک خراج تحسین وصول کر رہی ہے۔ اسی مضمون کو وہ اپنے ایک مصرع میں اسطرح ادا کرتا ہے

وہ پائے شرح میں مطلب نہ پوچھے جو متن ہرگز

اس "ہرگز" کی شان انکار دیکھئے۔ عشق حقیقی کی اس تفریح پر غور کیجئے۔ شاعر کا ایمان ہے کہ جسطرح ادق مضامین کے سمجھنے میں مبتدی شرح سے کام لیتے ہیں یہاں تک کہ خود مطالب پر حاوی ہو جاتے ہیں اسی طرح وہ قلوب جو نور معرفت سے محروم ہوں حسنِ ظاہری سے "حسنِ مطلق" کا پتہ چلاتے ہیں اور عشق مجازی سے عشق حقیقی کا راستہ ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔

بعض کوتاہ نظر تذکرہ نویسوں نے اسکی عاشقانہ شاعری کو دیکھ کر اُسے ایک بوالہوس عاشق مزاج اور حسن پرست شاعر سمجھا ہے۔ وہ حسن پرست ضرور ہے جسکی جھلک اسکے کلام میں نظر آتی ہے لیکن وہ بوالہوس عاشق نہیں

جو حسینانِ عالم پر نفس پرستی کی خاطر فریفتہ ہو جائے وہ سالکِ راہِ طریقت ہے اور عشقِ مجازی اسکے ایمان کا ایک جزو ہے

ولی نے شاہ نورالدین قدس سرہ سے درسِ سلوک لیا تھا اور کتاب نورالمعرفت تصنیف کی تو انہیں کے نام سے موسوم کر دی۔ اسکے مسلک میں زیادہ تر حسن و نور کا نظریہ کارفرما ہے جو فرقۂ سہروردیہ کی عطا ہے۔ ولی کے نظریہ حسن و عشق کو سمجھنے کیلئے اس فرقہ کے عقائد کو سمجھنا ضروری ہے

فرقہ سہروردیہ کے عقائد۔ اس فرقے کے بانی شیخ شہاب الدین سہروردی ہیں۔ یہہ بزرگ اپنے وقت کا ارسطو تھا تھوڑی عمر پائی۔ بہت سی کتابیں تصنیف کیں اور حقیقت یہہ ہے کہ سب کی سب لاجواب ہیں۔ انکی وسیع المشربی اور آزاد خیالی نے تنگ خیال مولویوں کو انکا دشمن بنا دیا۔ کمال کا شہرہ دور دور پہونچا۔

عبدالعزیز ابنِ سلطان صلاح الدین نے مجبور کر کے اپنے پاس بلایا۔ انکی آزادیٔ خیال اور فلسفۂ تصوف نے کم نظر قاضیوں کو مشتعل کر دیا۔ نتیجہ کے طور پر ایک عالم بے بدل اور ایک نوجوان فلسفی کا خون کفر کے فتوے سے بہا دیا گیا۔ فرقہ سہروردیہ شیخ کے اعتقادات پر اب تک کاربند ہے اور شیخ نے یہہ خیالات ابن سینا کے ایک نظریہ سے حاصل کئے تھے جسکا لب لباب یہہ تھا کہ عشق درحقیقت ستائش حسن کا نام ہے عشق کا رجحان ہر انسان میں طبعی ہے اور اس طبعی میلان کی بدولت ہر موجود اپنے مافوق تک پہونچنا چاہتا ہے اسی طرح موجوداتِ عالم ارتقاء کے منازل طے کر رہے ہیں جسکی آخری منزل کا نام "کمال" ہے۔ اس عشق و حسن کی کشش کا نام "وجود" ہے۔ وجودِ مطلق حقیقت میں حسنِ مطلق کو چاہنا۔ طلب کرنا ہی وجود ہے ورنہ عدم۔ یہہ حسن یا ایک نورِ قاہر تمام عالم کو گھیرے ہوئے ہے۔ وہ ازلی ہے ابدی ہے غیر فانی ہے اور قائم بالذات ہے۔ اسکا خالق کوئی نہیں وہ کائنات کا خالق ہے اور کائنات اسکا مظہر ہے۔ اس نور کی دو تجلیاں ہیں (۱) غیر مادی (۲) حادث

(۱) غیر مادی شکل و صورت سے مبرا ہے نہ اسکی سو ہے نہ سمت نہ رنگ ہے نہ بو نہ کیف ہے نہ کم نہ حد ہے نہ تعین

اسکا خاص جوہر احساس یا علم ہے۔

(۲) حادث یہہ ایک غیر مادی نور ہے جسکو حسن مجازی سمجھنا چاہئے اسکو صورت بھی ہے اور یہہ صفت بھی بن سکتا ہے لیکن یہہ قائم بالذات نہیں یعنی یہہ مہتاب ہے اور اسی آفتاب حقیقی سے کسب ضیاء کرتا ہے۔

فرقہ سہروردیہ کے اس اصولی نظریہ کو سمجھنے کے بعد ولی کا فلسفۂ عشق سمجھنا بہت آسان ہوگیا ہے۔ آزاد ولی کی متصوفانہ شاعری کی نسبت لکھتے ہیں "قاعدہ ہے کہ جب دولت کی بہتات اور عیش و نشاط میں کچھ نکی پر خیالات آتے ہیں تو صوفیانہ لباس میں ظاہر ہوا کرتے ہیں اس وقت محمد شاہی دور نے درو دیوار کو مست کر رکھا تھا۔ جس سے تصوف کے خیالات عام ہو رہے تھے۔ دوسرے ولی خود فقر کے خاندانِ عالی سے تھے اور فقیری کے دیکھنے والے بھی تھے تیسرے زبان اردو کے والدین بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہیں اِن جذبوں نے انہیں تصوفِ شاعرانہ میں ڈالا اور دل کی امنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کر کے اس کام پر آمادہ کیا جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔"

کچھ ہو محمد حسین آزاد نے بڑی موزوں طبیعت پائی تھی فی البدیہہ کہا کرتے تھے۔ بھلا محمد شاہی دور سے ولی کے تصوف کو کیا لگاؤ اور پھر اسوقت جبکہ دولت کی بہتات اور تعیشات کی فراوانی ہو۔ تصوف دولت کی مستی میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ فقر کی مستی میں صورت پکڑتا ہے۔ ولی کو پیش قدمی کا تمغہ عطا کرنا اور اسکو سب سے پہلا صوفی شاعر بتلانا بھی سراسر غلط ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ زبان اردو کی طرح اردو زبان میں تصوف کے عنصر نے بھی دکن ہی میں ترقی کی اور یہیں اپنے ابتدائی ارتقائی منازل طے کئے لیکن ولی اس عنصر کا استاد اول کیسے ہوسکتا ہے جب اس کے پیش رو اِس خصوص میں اس سے پیش پیش ہیں ولی کی نسبت مصنف آئینہ معرفت رقمطراز ہیں:۔

"انکا کلام بتا رہا ہے کہ تصوف کے لحاظ سے یہ اسم با مسمّٰی تھے قطع نظر اسکے ان کے کلام میں قدم قدم پر تصوف کے نکات اور مسائل جلوہ گر ہیں اِن کا طرز بیان نہایت دلکش اور دلچسپ ہے۔ شعریت کہیں بھی

مشکل سے جانے پاتی ہے خشک مضامین کو بھی رنگین بنا کر شعر کے جامے میں پیش کرتے ہیں۔ ان کے اس انداز بیان سے صوفیانہ شاعری میں ایک ایسی تازگی پیدا ہو گئی جو ایک مدت کے لئے دوسروں کے دل و دماغ کو قوت پہونچاتی رہی اور لوگوں کے خیالات کو بلند پروازی کے طرف ابھارتی رہی۔" پھر آگے چلکر فرماتے ہیں :—

"ہمارے نزدیک ولی کا پایہ اس دور قدیم میں سب سے افضل ہے محض اس وجہ سے نہیں کہ ان کی زبان میں بہ نسبت دوسروں کے صفائی زیادہ ہے بلکہ علاوہ اس کے کہ جو اوپر ہم نے بیان کیا کہ ان کے کلام میں زیادہ دلکشی اور رنگینی ہے۔ ایک خاص بات یہہ بھی ہے کہ مضامین کی تہہ میں ڈوب کر وہ باتیں پیدا کرتے ہیں کہ جو دوسروں کو نصیب نہیں اور لطف یہہ ہے کہ سخت سے سخت بات کو آسان بنا کر اس طرح سناتے ہیں کہ فوراً دل میں اتر جائے چونکہ فطرتاً دل میں سوز و گداز لیکر آئے تھے اسلئے جو کچھ کہتے تھے اسکا اثر ہوتا تھا"

ہمیں اس سے اتفاق ہے۔ لیکن یہہ کہنا کہ "صوفیانہ شاعری میں ایک ایسی تازگی پیدا ہو گئی...." قرین انصاف نہیں کیونکہ ولی سے پہلے کا شاعر بحری ہے جس کی مثنوی من لگن سرتاپا تصوف میں ڈوبی ہوئی ہے اسکے دوسرے کلام سے بھی اسکے عارف کامل ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

بحری کا حمد انیت میں یوں نغمہ سرا ہیں قدامت زمانہ کے لحاظ سے زبان کہیں کہیں ناقابل فہم ہے۔

اے روپ تیرا رتی رتی میں — پربت پربت بنی بنی میں
پربت میں ادک نہ کم تپی میں — یکسار ہے راس ہو رتی میں
تو یک یو تمام رنگ تیرا — تو حل ہے یو حل ترنگ تیرا
یعنی کہ وجود سب تجھے ہے — اس سب کی لگی نسب تجھے ہے
([illegible]) درویش ہو دل کوں صاف رکھ صاف — سیمرغ کوں ہو سینہ کے قاف

درویش کوں کچھ بھی مال ہوئے تا کوئی سوں کچھ کمال ہوئے
اصلا یو خودی نہ آدمی کا اخوند خدا ہے اس خودی کا
اس وقت میں بیخودی سو ہے کیا نیئں یو خودی نور ہے خدا کا

دکن کے صوفی شعرا میں ایک اور شاعر باکمال سر آمد دور اول ہے وہ محمد قلی قطب شاہ کی ذات والا صفات ہے قطب شاہ صرف علم و فن۔ شعرا اور علما کا قدر دان اور سر پرست ہی نہ تھا بلکہ خود ایک زبردست شاعر تھا۔ اسکی قادر الکلامی اور صوفی کامل ہونے کا ثبوت اسکا کلام ہے جو ایک ضخیم کلیات کی صورت میں موجود ہے اور زبان حال سے اپنے کہنے والے کے مراتب کا اظہار کر رہا ہے تصوف میں سب سے اہم مسئلہ وحدت الوجود کا ہے۔ صوفیوں کا خیال ہے کہ جو کچھ ہے وہی نور مطلق ہے اور باقی سب اسکے جلوؤں کا مظہر ہے۔ اس خیال کو سلطان قلی قطب شاہ نے کس خوبی سے باندھا ہے۔

وحدانیت۔ رکھ ایک ہے ہر ٹیک کد[1] حسن لاکھ چمن ہے لکھ جو سنے ہے ہر ٹھار دو لے ٹیک رتن[2] ہے

متذکرہ بالا شعر معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے۔ ایسی عمدہ تشبیہیں لائی گئی ہیں کہ ان پر جتنا غور کیجئے اتنا ہی اسکی لطافت اور معنویت بڑھتی جائیگی۔

مشاہدہ۔ کس ٹھار میں دستا نہیں سب ٹھار[3] ہے بھرپور دیکھن کوں سکت کاں اسے ہر ٹیک نین ہے

اگرچہ اسکا وجود عالم پر چھایا ہوا ہے لیکن ہر ایک آنکھ میں اتنی سکت کہاں جو اسکو دیکھ سکے

مجاہدہ اسکے سو پرت[4] پنت میں چل سیس[5] سوں قطبا تجھ کوں دو مددگار حسینؓ اور حسنؓ ہے

واہ اس عارف کامل کا کیا کہنا جو منزل مجاہدہ (اپنے نفس سے حق کیلئے جہاد کرنا) میں حسینؓ و حسنؓ کی پیروی کرے جنکے عشق حقیقی نے دنیا کو درس صداقت پڑھایا اور اپنے محبوب و معبود حقیقی کی راہ میں اپنا سب کچھ قربان کر کے دنیا کو

۱۔ ہر ایک طرف ۲۔ ایک زبان ۳۔ طرف ۴۔ راہ محبت ۵۔ سر

بتایا کہ عاشق کامل اس کٹھن راہ کو کسطرح سر کے بل طے کرتا ہے۔ ایسی عظیم الشان قربانیاں اسلام میں تو کیا اسلام کے باہر بھی نہیں مل سکیں۔

عشق کے متعلق اسکا خیال ہے ؎

جیکوی ہے عشق میں ثابت سدا ہے جیونا اسکا سواس کے نائوں سے میخانہ سب معمور کر ساقی

نہیں عشق جس وہ بڑا کوڑ ہے کدھیں اس سے مل بیسیا جائے نا[1]

ولی نے اسی مضمون کو یوں ادا کیا ہے

اے ولی غیر عشق حرف دگر!! پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

ولی نے تصوف میں قطب شاہ کی پیروی کی ہے جسکا اعتراف اسنے خود کیا ہے ؎

ہر یک حرف نہ پاوے بتا لب بہ لب ستی پایا ہوں علم عشق معانی[2] قطب ستی

اور حقیقت یہہ ہے کہ قطب شاہ صوفیانہ شاعری کا معمار اول ہے اور انصاف اسکا مقتضی ہے کہ اسکے کمال فن کو سراہا جائے اور اسکو اسکی نزاکت خیال۔ زور تخیل اور حسن بیان کے لحاظ سے نیز اسکے عرفان و معرفت کی گہرائیوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے دکن کی قدیم صوفیانہ شاعری میں استاد اول کا خطاب دیا جائے۔ ولی کا تصوف و عرفان بھی قطب شاہ کی معرفت و عشق حقیقی سے بازی نہیں لے جاسکتا۔

اب ہم ولی کے چند اشعار تصوف کے خاص خاص مسائل پر نقل کرتے ہیں۔

تصوف میں عشق کے معنی و مراتب تو ظاہر کر دئے گئے ہیں اب اور اعتقادات ملاحظہ ہوں۔

دل ۔ تصوف میں سب کچھ دل کی صفائی۔ پاکیزگی اور نیت پر منحصر ہے۔ صوفیائے کرام نے صفائے قلب کا سبق

---

۱ بیٹھا ۲ محمد قلی قطب شاہ کا تخلص قطب کے علاوہ معانی بھی تھا۔

طرح طرح سے دیا ولی کہتے ہیں۔

خودی سے اولاً خالی ہوا ے دل اگر اس شمع روشن کی لگن ہے
کہی ہے اہلِ دل نے یہ بات مجھ کوں دل سے عارف کا دل بغل میں قرآن ہیکلی ہے

بے خبری - تصوف میں ایک مقام ایسا بھی ہے جسکو ہاموت کہتے ہیں جہاں پہونچکر صوفی کو خود اپنی خبر نہیں رہتی ولی اس بے خبری کی طرف یوں اشارہ کرتے ہیں ؎

چمن میں دہر کے ہرگز نہیں ہوا معلوم کہ کب ہے فصلِ ربیع اور کہاں ہے فصلِ خزاں

غالب کہتے ہیں ؎

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہمکو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

میر اپنے انداز میں کہتے ہیں ؎

بےخودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

فنا و بقا - اس مشکل مسئلہ کو ولی نے کس سادگی سے سلجھا دیا ہے اس ایک شعر کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ جتنا غور کریں اتنا حظ ملتا جائیگا ؎

از بسکہ زندگی میں یوں محو ہوں ولی میں مشکل ہوا اجل کوں ملنا سراغ میرا

غالب فنا تعلیم درسِ بےخودی ہوں اس زمانے سے کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر

یعنی جیتے جی ہی میں نے اپنی ہستی مٹا ڈالی اور نفس کو فنا فی اللہ کر ڈالا اب جب کہ میں نے اپنی ہستی کو اسکی ذات میں ضم کر دیا ہے تو موت کوئی چیز نہ رہی۔ زندگی ہی میں حیات ابدی نصیب ہو گئی۔

ترک دنیا - صوفی کیلئے ترک دنیا بہت ضروری ہے اگرچہ دنیاوی تعلقات اور نفسیات زندگی کو ترک کر دینا

کاری دارد لیکن تارکانِ دنیا کو اس تلخی میں بھی وہ لطف ملتا ہے کہ ایسی لذت کسی مادی شے میں نہیں ملتی۔

ولی
ترک لذت کی جنکوں ہے لذت ۔ شکر اسکوں ہے زہر۔ زہر شکر
ترک لباس جب سوں کیا ہوں جہاں میں ۔ جز خاکِ کوئے یار ہماری قبا نہیں

بے ثباتی دنیا۔ بھروسہ نہیں دولت تیز کا ۔ عجب کیا کہ ناظہر آوے زوال

میرانیس نے اسی بے ثباتی دنیا کو اس رنگ سے بیان فرمایا

کسی کی ایک طرح سے بسر ہوئی نہ انیس ۔ عروج مہر بھی دیکھا تو دو پہر دیکھا

بے نیازی۔ نے منصب و زر چاہئے نے ملک و وظیفہ ۔ ہر روز ترا نام وظیفہ ہے ولی کوں
ولی جنت میں رہنا ہے نہیں درکار عاشق سوں ۔ جو طالب لامکاں کا ہے اسے مسکن سوں کیا مطلب
پروا کفن کی نئیں مجھے اے شمع بزم عاشقاں! ۔ تجھ عشق میں جو سر دیا اس کوں کفن سوں کیا غرض
آزاد کوں جہاں میں تعلق ہے حال محض ۔ دل باندھنا کسی سوں ہے دل پر وبال محض

آتش نے اسی مسئلہ کو یوں بیان کیا ہے ؎

کام ہے اللہ سے عالم سوں کچھ مطلب نہیں ۔ مشتری یوسف کے ہیں خواہاں نہیں بازار کے

ولی ہمہ اوست کے عظیم الشان مسئلہ کو ایک شعر میں اسطرح سمجھاتا ہے ؎

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی ۔ یو بوجھ کے عاشق ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا
رخ ترا آفتاب محشر ہے !! ۔ شعلہ اس کا جہاں میں گھر گھر ہے

عقل اور عشق

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ ۔ آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

عشقِ حقیقی اور معرفت کی گتھیاں عقل سے سلجھائی نہیں جاتیں۔ یہاں طائرِ ہوش کے پر جلتے ہیں اور فلسفہ بھی کہتا ہے کہ عقل جہاں ختم ہوتی ہے حیرت کا آغاز ہوتا ہے۔ حیرت نام ہے عقل کی کوتاہی کا۔ جب علت و معلول کا ربط باقی نہیں اور منطق و حکمت سے کام نہیں چلتا تو انسان محسوس کرتا ہے لیکن کہہ نہیں سکتا عقل و خرد پر حیرت اور استعجاب غالب آ جاتا ہے

خواجہ آتش کہتے ہیں ؎ دکھلا کے جلوہ آنکھوں نے اک شمع نور کا — گل کر دیا چراغ ہمارے شعور کا

توکل و قناعت ہے فیض سے جہاں کے دل بافراغ میرا — مرہم کا اب نہیں ہے محتاج داغ میرا

یعنے جب تک میں دنیا کو چاہتا رہا دنیا نے مجھے زخم پر زخم دیئے جب سے میں نے دنیا سے منہ موڑ لیا اور خدا کی ذات پر توکل کر کے بیٹھ رہا میرے داغِ دل چنگے ہو گئے گویا توکل ہی مرہمِ زخم ثابت ہوا جس نے دل کی جراحتوں کو شفا بخشی۔

پایا ہوں ولی سلطنتِ ملکِ قناعت — اب تخت و چتر میرے لئے ارض و سما ہے

معرفت عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اسکا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اسکا

یہہ بھی تصوف کا ایک نازک مسئلہ ہے۔ شاہ ولایت سے دریافت کیا گیا کہ خدا کہاں ہے ارشاد ہوا کہ اسکا نور ہر شئے میں موجود ہے وہ ہر جگہ ہے موجوداتِ عالم کا ہر ذرہ اسکے حسن کا مظہر ہے لوگوں نے پوچھا کہ پھر وہ نظر کیوں نہیں آتا۔ فرمایا کہ وہ اتنا ظاہر ہے کہ شدتِ ظہور سے مستور ہو گیا۔

شاعر اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے کہتا ہے کہ زیادتیِ حسن نے آنکھیں خیرہ کر دیں اور یہی خیرگی بے بصارتی کا سبب بن گئی۔ شدتِ جمال نے منظور کو چھپایا اور ناظر کی آنکھوں میں بجائے خاک کے نور جھونک کر مطلوبِ حقیقی کے چہرۂ زیبا پر "دیدۂ حیراں" کے "نقاب" ڈالے۔ غالب اسی مضمون کو اس طرح بیان کرتے ہیں ؎

واقف نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

میر درد کہتے ہیں ؎ نظر میرے دل کی پڑی درد کس پر — جدھر دیکھتا ہوں وہی روبرو ہے

حقیقتِ عشق حسن تھا عالمِ تجرید میں سب سوں آزاد طالبِ عشق ہوا صورتِ انسان میں آ

حدیثِ قدسی ہے "کُنتُ کَنزاً مَخفِیًّا فَاَحبَبتُ اَن اُعرَفَ فَخَلَقتُ الخَلقَ" ترجمہ ۔ میں ایک پوشیدہ خزانہ تھا۔ پس میں نے محبت کی کہ پہچانا جاؤں پھر خلق کیا خلقت کو۔

اسی طرح کا ایک عقیدہ اہلِ ہنود کے ہاں بھی ہے۔ انکا ایقان یہہ ہے کہ جب اللہ ہی اللہ تھا اور ماسوا اللہ کچھ نہ تھا تو اسنے چاہا کہ اپنی قدرت کا مظاہرہ کرے۔ اس خیال کے ساتھ ہی اسکے دل میں خود بخود کام پیدا ہوگیا۔ کام یا کام دیو محبت کے دیوتا کا نام ہے وہ پریوں اور آسمانی مخلوق کا بادشاہ ہے ۔ اس کے ہاتھ میں تیر و کمان ہیں۔ بڑا حسین ہے بہت شوخ و شنگ ہے ۔ پریوں اور فرشتوں کے جھرمٹ میں ہاتھ میں ایک سرخ جھنڈا لئے پھرتا ہے جس پر مچھلی کی تصویر بنی ہے ۔

شاعر کا مطلب بھی یہی ہے بلکہ حدیثِ قدسی کی طرف اشارہ ہے ۔ کہتا ہے کہ حسنِ مطلق جب مجرد تھا تو نہ آسمانی مخلوق تھی نہ ارضی ۔ دنیائے رنگ و بو کیف و کم سے آزاد تھی اور وہ بھی محبت کی لگاوٹ سے ناآشنا تھا تو وجود ماسوا (ممکنات) کا محرک ہوا ۔ اسنے محبت کی ۔ اس محبت کا تقاضہ تھا کہ کوئی چاہنے والا ہاتھ آئے ۔ اس لئے اس نے آدم اور بنی آدم سے اپنی دنیا بسائی اور دلِ انسان میں ایک تڑپ ایک خواہشِ جستجو رکھدی ۔ اسی جستجو کی دھن نے اسے کہاں سے کہاں پہونچا دیا یہاں تک کہ اسکی نگاہ کے آگے عرصۂ عالم تنگ نظر آنے لگا آخر اسنے آسمانوں کی خبر لینی شروع کی یہہ سب تو ہوا لیکن اسکا شوقِ جستجو ابھی تشنہ ہے اور یونہی رہیگا ۔ وہ اسی حسنِ مطلق کی تلاش میں ہے جو پردے ہی پردے میں اسکو کنوئیں جھنکواتی ہے ۔

اخلاق و موعظہ

تصوف و عرفان کے علاوہ ولی کا تخیل جس خاص دائرہ فکر میں گھومتا ہے وہ اخلاق و موعظہ ہے مشرقی شاعر کی ذہنیت کی یہہ بھی ایک خصوصیت ہے کہ وہ انسانی زندگی کے اعلے مقاصد اور دنیاوی زندگی کی بے ثباتی کا تذکرہ بھی ایک حد تک لوازمات شاعری میں تصور کرتا ہے۔ خصوصاً شعرائے متصوفین میں یہہ رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ سنائی عطار رومی۔ صائب اور بیدل وغیرہ کے کلام کا تو یہہ جزو اعظم ہے۔ غزل گو شعرا نے بھی اس خصوص میں شعرائے متصوفین کی تقلید کی ہے۔ خصوصاً ہندوستانی شعرا میں تو شاید ہی کوئی شاعر ایسا ہو جسکے دیوان میں چند اشعار یا کم از کم ایک آدھ بیت دنیا کی بے ثباتی۔ زندگی کی رواداری اور پند و اخلاق کے متعلق نہ پائی جاتی ہو۔

ولی کو قدرت نے ایک حقیقت شناس دل بخشا تھا۔ پھر آنکھ کھلی تو ایسے مقام پر جو ابتدا سے صاحبانِ دل کا گہوارہ رہا۔ نشو نما پائی تو ایسے ملک میں جہاں عرفان و معرفت کا طوطی صدیوں بولتا رہا اور صحبت بھی ہوئی تو ایسے سے جو خود بھی عالم باعمل اور حقیقت جو تھا۔ ان سب واقعات یا اتفاقات نے مل جل کر ولی کو جوہر کامل بنایا جسکو عرفان اور علماء کے فیضِ صحبت و بیعت نے اور بھی چمکا دیا۔

ولی کا کلام ولی کی شخصیت کا آئینہ ہے۔ وہ ایک عارف کامل اور ناصح مخلص ہے ذرہ ذرہ میں وہ روح کائنات کا جلوہ دیکھتا ہے۔ وہ حقیقت جو۔ حقیقت بیں اور حقیقت شناس ہیں۔ اسکو ظاہر پرستی اور نمود و نمائش سے سخت نفرت ہے۔ باطنی قوتوں کا ارتقا اسکا مقصد حیات ہے۔ دنیاوی تعیشات سے نہ اسے خود کوئی دلچسپی ہے نہ وہ ان دلچسپیوں کو کوئی اہمیت دیتا ہے۔ وہ ظاہر پرستوں سے متنفر ہے۔ ایک صوفی کی طرح اسکا مذہب صلح کل ہے اور اسکا مقولہ مرنجان و مرنج ہے۔

ظاہر پرستی کی مذمت اور صداقت کی تعلیم

غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہوشیار ہو ہشیار ہو — کب لگ رہیگا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو
گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہدِ معنی کا رو — ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار ہو

یہہ حرف راست جا کے کہو خرقہ پوش کوں — اے کج خرام چھوڑ دے ظاہر کے جوش کوں
دیتے نہیں ہیں ساغرِ دل خود فروش کوں — وحدت کے میکدے میں نہیں بار ہوش کوں
اس بے خودی کے گھر کی طرف سُدھ کوں ڈال چل

بد خصلتی کی مذمت حق جوئی اور خوش خصلتی کی تعلیم

بوجھا ہوں دل کے فیض سوں سارے جگت کی گت — آوے نہ کوئی کام بجز حق کی معرفت
بد خصلتی کے گل میں نہیں بوئے عافیت — گر عاقبت کے ملک کی خواہش ہے سلطنت
خوش خصلتی کے ملک میں اے خوش خصال چل

تسلیم و رضا

دم تسلیم سوں باہر نکلنا سو قباحت ہے — نہ دھر اس دائرے سوں ایکدم باہر چرن ہرگز

ہر درد پہ کر صبر ولؔی عشق کی رہ میں — عاشق کوں نہ لازم ہی کرے دکھ سوں شکایت
معرکہ میں عشق کے ہر بوالہوس کا کام نئیں — دیکھ حالت کیا ہوئی منصور سے سردار کی

ولؔی کا خیال ہے کہ عشقِ حقیقی کچھ منہ کا نوالہ نہیں ہے۔ یہہ وہ خطرناک گھاٹی ہے جہاں منصور جیسے پختہ مغزوں کے قدم بھی لڑکھڑا جاتے ہیں۔ پس چاہیئے کہ انسان ہر حال میں راضی برضا رہے اور راہ تسلیم و رضا میں وہ مدارج طے کرے جو مقام "نفسِ مطمئنہ" تک پہونچاتے ہیں

علم معرفت وہبی ہوتا ہے

عشق کے رمز سوں نہیں آگاہ — کیا ہوا توں کیا کتاباں جمع
اے ولؔی ہر کوئی نئیں ہے قابلِ فیضِ الٰہ — عارفاں کوں حق نے بخشا ہی جواہر بے بہاء
اے ولؔی غیر عشق حرفِ دگر — پختہ مغزاں کے نزد ہے خامی

گذر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا ہوا دھاوا مٹھائی پر مگس کا

اشعار متذکرہ بالا شاعر کی ذہنیت کا پتہ دیتے ہیں۔ جسکا ایقان ہے کہ ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

علم معرفت اکتسابی علم نہیں جو کتابیں جمع کرنے یا جھوٹ موٹ کی باتیں بتانے سے آجائے۔ اگرچہ عشق حقیقی کے دعویدار بے شمار پیدا ہوتے جارہے ہیں لیکن عاشق صادق کا مرتبہ ملنے والوں ہی کو ملتا ہے ع دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھکر ولی عشاق کاذب کو بوالہوس کہتا ہے اور انہیں اسطرح نصیحت کرتا ہے۔

تیری نگاہ خاطر نازک پہ بار ہے اے بوالہوس، ولی کی طرف بار بار دیکھ

اب اسکی چند اور بیش قیمت اور قابل قدر نصیحتیں درج کی جاتی ہیں۔

خاکساری کی تعلیم

سرکشوں سوں ہے راہ عرفاں دور ان کو یک آن نہئیں ہے بار حضور

خود نمائی کا ترک یاں ہے ضرور خاکساری ہے حق آگے منظور

خاک درگاہ مصطفےٰ کی قسم

پاکبازی

صدق ہے آب ورنگ گلشن دیں پاکبازی ہے شمع راہ یقیں

صبر کی نصیحت

گریباں صبر کا مت چاک کر اے خاطر مسکیں سنے گا بات وہ شیریں بچن آہستہ آہستہ

بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سوں ہرگز چلتا ہوں ترا درد میں درماں سوں کہونگا

وقت کی قدر۔ مطلع کا مصرعہ اے ولی درد زباں کر رات دن غفلت میں وقت اپنا نہ کھو ہشیار ہو

خاموشی کی تلقین۔ ہمیشہ لشکر آفات سوں رہے محفوظ نصیب جسکوں ہوا ہے حصار خاموشی

جذبۂ کامل کا اثر ولایت صادقی پاوے وہی ہے شیر دل جسمیں دیا آجذبۂ کامل دکھائی اپنے تئیں اس میں

دگر نہ شیر مردی ولایت کاں ہے جس بس میں ولی تجکوں رکھینگے شیر مرداں اپنی مجلس میں

رہے گر سگ دائم تو نبیؐ کے آستانے پر

عارف کو زینت سے کام نہیں   مجھے اسباب جو دینی سوں دائم عکس ہو دیں   کیا جو ترک دنیا کوں اسے درپن سوں کیا مطلب

سطحی زہد کی مخالفت۔   شیخ یاں بات تری پیش نہ جائیگی کبھی   زہد کی چھوڑ کے مت مجلس رندان میں آ

کسقدر سنجیدہ مذاق ہے شاعر کہتا ہے کہ شیخ جو ہر بات پر دلیل و برہان لاتا ہے عشق و معرفت۔ سلوک و طریقت کے مسائل کیا جانے۔ اسکی نظر سطحی ہے وہ خود اس سطح پر نہیں ہے جہاں عقل معطل ہو جاتی ہے۔ علت و معلول کا ربط ٹوٹ جاتا ہے اور روحانی دنیا شروع ہوتی ہے ایسی صورت میں رندوں کی صدائے ہائے وہو میں شیخ کا اکتسابی علم نقار خانے میں طوطی کی آواز ہوکر رہجائیگا۔ اگر آنا منظور ہی ہو تو بہتر ہے کہ وہ اپنے مسلک زہد کو چھوڑ کر آئے جہاں قواعد و ضوابط اور قیود و شرائط پر زد ردیا جاتا ہے۔ اسی مضمون کو وہ ایک اور شعر میں یوں بیان کرتا ہے۔

زاہد کی بے بصری   زاہد اگرچہ فہم میں ہے بوعلیٔ وقت   میرے سخن کے رمز کوں پایا نہیں ہنوز

دل آزاری بدترین گناہ ہے۔   حق پرستی کا اگر ہے دعوے   بے گناہوں کو ستایا نہ کرو

ایک عجیب خیال۔   سخن صاحب سخن کا سن کے ملنے کی ہوس مت کر   جواہر جب ہوئے حاصل تو پھر معدن سوں کیا مطلب

فکر کا مرتبہ۔   اے ولیؔ فکر صاف صاحبدل   گوہر بحر نکتہ دانی ہے

طمع برا عیب ہے   طمع مال کی سر بسر عیب ہے   خیالات گنج جہاں سر سوں ٹال

غرض پند و نصیحت اخلاق و حکمت کے جیسے آبدار موتی ولیؔ نے پہلے پہل لٹائے ہیں وہ اپنی آپ مثال ہیں تقریباً اسکا ایک تہائی کلیات اسی نغمۂ روح افزا سے گونج رہا ہے پھر پیرایہ ایسا دلنشیں اور زبان ایسی میٹھی کہ اس کی ترنم ریزیاں آج تک فردوس گوش بنی ہوئی ہیں۔

ولی کی شاعرانہ زبان

خیال اور زبان کو گہری نسبت ہے بلکہ حقیقت میں یہہ ایک ہی چیز کے ۲ دو پہلو ہیں خیال کا کام معنی آفرینی ہے اور زبان کا کام خیال کو لفظی جامہ پہنانا۔ چونکہ نطق معنی یا منطق کلام کی لفظی تشکیل کرتا ہے۔ اِسی لحاظ سے کسی شاعر کے حسن کلام پر تنقید کرتے ہوئے ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھنا پڑتا ہے ایک حسن معنی و منطق دوسرے حسن بیان یا زبان۔

ہر شاعرانہ کلام کے نقد و تبصرہ میں پہلے حسنِ خیال کو اہمیت دی جاتی ہے اور پھر حسنِ بیان کو ہم کلام ولی کے معنوی یا اندرونی پہلو کا جائزہ لے چکے ہیں اب اسکے بیرونی یا ظاہری پہلو پر روشنی ڈالینگے کسی شاعر کے کلام کے بیرونی پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے ان خصوصیتوں پر نظر ڈالنی پڑیگی۔

(۱) ظاہری ساخت (۲) لفظی خزانہ (۳) اسلوب بیان (۴) صنائع بدائع (۵) مرکب الفاظ اور ترکیبیں

حسنِ بیان کی خوبی یہہ ہے کہ زبان میں صفائی ہو۔ الفاظ موثر اور انکی نشست و ترکیب دلفریب ہو۔ اثر آفرینی کی بہترین مثال میر کے تغزل میں ہے مثال کے طور پر وہ غزل دیکھی جاسکتی ہے جسکا مطلع ہے ؎

میر الٹی ہوگئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا　　دیکھا! اس بیماریٔ دل نے آخر کام تمام کیا

الفاظ کی شان نشست اور ترکیب کی ہمواری غالب کے کلام کو ایک ممتاز حیثیت بخشتی ہے چنانچہ اسکی وہ غزل قابل دید ہے جسکا مطلع ہے ؎

ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں　　کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

دلی کے کلام میں میر کا سوز و گداز اور اثر آفرینی۔ غالب کا حسن بیان اور شوکت الفاظ پائی جاتی ہے پائے جاتے ہیں۔ دو سو سال پہلے کے مروج الفاظ سے قطع نظر کرکے اسکے تغزل کے انداز بیان اور وہ خیال کے مطابق دیکھا جائے تو وہ آج بھی دوسروں سے ہٹی نہیں مثلاً دلی کی یہہ ۲ دو غزلیں قابل ذکر ہیں جو

۱۔ وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ آتشِ عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

۲۔ شرابِ شوق سوں سرشار ہیں ہم کبھو بے خود کبھی ہوشیار ہیں ہم

ولی کے کلام کی ظاہری ساخت۔ کلام ولی کی ظاہری ساخت میں بحور۔ اوزان۔ ردیف اور قافیہ وغیرہ آجاتے ہیں۔ اسکے ہاں سالم بحور بھی پائی جاتی ہیں اور مزاحف بھی مسدس بحریں زیادہ پائی جاتی ہیں مثمن بھی ہیں لیکن مضاعف کم ہیں بحرِ ہزج۔ بحرِ ہزج مزاحف۔ بحر متقارب۔ بحر متقارب مزاحف۔ بحر رجز۔ بحر رجز مزاحف بکثرت پائی جاتی ہیں۔ ولی کا مشہور قصیدہ۔

تیرے قدم کے فرش رہ میں ہے زمین سب دل اچھو تجھ نقش پا مجھ سیس کا حب الوطن سب دن اچھو

غرض اسکے پاس مختلف اوزان کی ایسی فراوانی اور رنگارنگی ہے کہ بیسویں صدی کے شعرا میں وہ بات نہیں۔

یوں تو اسنے ہر زمین اور ہر بحر میں غزل کہی ہے لیکن وہ مترنم بحروں کو زیادہ پسند کرتا ہے قافیہ اور ردیف کے لحاظ سے اگر ولی کے کلام کو جانچا جائے تو معلوم ہوگا کہ اسکے ہاں گوناگونی کی کمی نہیں۔ اسکی بعض غزلیں ایسی سنگلاخ زمینوں میں ہیں جو تقریباً ایک صدی بعد اردو میں رائج ہوئیں۔ لکھنو میں انشاء اور مصحفی اور دہلی میں نصیر اور ذوق کو ایسی سخت زمینوں میں طبع آزمائی کرنے کا بہت شوق تھا۔ ولی کی بعض غزلیں اسکی مشکل پسندی کو ظاہر کرتی ہیں ایسی غزلوں کے چند اشعار مثالاً درج ہیں۔

مجھ گھٹ میں اے نگھر گھٹ ہی شوق تجھ گھونگھٹ کا دیکھیں سوں لٹ گیا دل تیری زلف کا لٹکا

ہرگز ولی کسی کن شناکی ترا نہ ہوتا! گر تجھ میں اے ہٹیلے ہوتا نہ طور ہٹ کا

ترنم ریزیار

نہ پوچھو خود بخود ہوش میں اڑی ہے رقیب روسیہ فتنہ کی جڑ ہے

ولی نوں بحرِ معنی کا ہے غواص ہر اک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے

پوری پوری غزلیں ایسی ہی ہیں۔ باوجود دقتِ قوافی کے ایسی میٹھی زبان میں غزلیں کہنا اس مطربِ اول ہی کا حصہ ہے

اس کے ہاں غزلوں کے بعض مجموعے ایسے بھی ملتے ہیں کہ ان کے قافیے ردیفوں کے ساتھ بالقصد جوڑے گئے ہیں اور حروفِ تہجی کا تسلسل باقی رکھنے کے لئے ان زمینوں میں کلام موزوں کیا گیا ہے جیسے

ستی نے تجھ نین کی مجھے بے خبر کیا ! — دل کوں میرے بھواں تے تیری جیوں جھنور کیا
تیرا یو شعر جگ میں موثر ہے اے ولی — تو دل میں ہر ایک کے جا کر اثر کیا

چونکہ اس غزل میں قافیہ (جھنور۔ خبر) اور ردیف (کیا) ہے اس کے بعد کی غزل قصداً اسی ردیف میں لکھی گئی ہے لیکن قافیہ بدل دیا گیا یعنی (ر) کے بعد (ز) لا کر حروفِ تہجی کی ترتیب برقرار رکھی گئی۔

خدا نے مکھ پہ ترے بابِ حسن باز کیا — قد بلند کوں تیرے تمام ناز کیا
ولی اس کے قدمبوس کے شرف سوں مجھے — ہزار شکر کے دلبر نے سرفراز کیا

اسی طرح اکثر الف کے بعد ب۔ پ۔ ت۔ د۔ ر وغیرہ قافیے لائے گئے ہیں۔

ولی کا لفظی خزانہ کلامِ ولی میں ہندی الفاظ بہ نسبت آج کل کے بہت زیادہ ہیں۔ الفاظ شاعر کے تخیل کا پرتو ہوتے ہیں۔ اگر شاعر کے تخیل میں نزاکت اور شائستگی ہو تو اس کے الفاظ بھی خوبصورت اور شگفتہ ہوں گے۔ اور اگر اس کا تخیل اداس اور بھدا ہو تو الفاظ بھی کرخت اور بھونڈے ہوں گے۔ جیسا کہ ہم نے بیان کیا ہے خیال کا ظاہری پہلو لفظ ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ولی کے حسین تخیل نے الفاظ کو بھی ایسے دلفریب سانچوں میں ڈھالا ہے کہ ان کی مترنم اور میٹھی آوازوں سے دل کی کلی کھل جاتی ہے۔ چونکہ ہم نازک سے نازک خیال کو بھی الفاظ ہی کے ذریعے سے ادا کر سکتے ہیں اس لئے چاہیئے کہ خیال کی طرح وہ بھی نازک اور نفیس ہوں یہ چیز ولی میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اس کو الفاظ کے انتخاب میں کچھ ایسی مہارت حاصل ہے کہ اگر اس کو ولی کی کرامت کہئے تو بے جا نہ ہوگا۔ وہ خیال کے مطابق

الفاظ لانا ہے۔ ان اشعار میں الفاظ کی نشان نشست و حسن ترکیب قابل داد ہے ؎

ایس کے زلف کا فر کیش کی جھلک کا ٹک دکھلا
کہ زاہد بے خبر دم مارتا ہے پارسائی کا

ہوش کھوتی ہے نازنین کی ادا
سحر ہے سرو گل جبیں کی ادا
گر ہے مطلوب تجھ کوں نقش مراد
دیکھ اسکی بھواں کی چیں کی ادا
اے ولی دل کوں آب کرتی ہے
نگہ چشم سرمگیں کی ادا

چلنے میں اے بے تخیل ہاتھی کوں لجاوے توں
بے تاب کرے جگ کوں جب ناز سوں آوے توں
گویا کہ شفق پیچھے خورشید ہوا ظاہر!
جب اوٹ میں پردے کی چہرے کوں چھپاوے توں

غرض ولی کا لفظی خزانہ حسن اور نزاکت، زور تخیل اور رنگینی خیال سے بھرپور ہے۔ جس میں ہندی عنصر بھی ہے اور دکنی بھی۔ وہ بھی جو متروک ہو چکا اور وہ بھی جو آج تک مستعمل ہے۔ ہم ہر عنصر کے چند الفاظ بطور نمونہ پیش کرتے ہیں

ہندی عنصر۔		سمرن	تسبیح	برہ۔برھا	ہجر۔فراق	نیہہ	محبت
جودھا	بہادر	سرج	سورج	اچرج	تعجب	پگ	پاؤں
پران	جان	سکل	تمام	بان	تیر	بھوجن	کھانا
بل	زور طاقت	سندر	خوبصورت	اگن	آگ۔گرمی	سنسار	دنیا
بلی	طاقتور	سیس	سر	دان	خیرات	رتن	جوہر
درس۔درشن	دیدار	دیا	مہربانی	ادھک	بہت	من	دل
پریم	محبت	دھرم	ایمان	ہردا	دل	مکھ	منہ
نین	آنکھ	تروار	تلوار	نرمل	صاف۔پاکیزہ	مرگ	ہرن
درپن	آئینہ	پربت	پہاڑ	مدھ	شراب	ماس	گوشت

دکنی عنصر (ان میں وہ الفاظ بھی ہیں جن کا تعلق برج بھاشا سے ہے لیکن چونکہ دکن کی روزمرہ میں مستعمل تھے اور اکثر ابھی تک ہیں اسی لئے انہیں دکنی عنصر کہا گیا)

سنکل	زنجیر	لبنار	سامان	اٹکل	قیاس	بھاتا	ڈالنا
سنگات	ساتھ	بسرنا	بھولنا	پونچھ	ایسا ہی	نئیں	نہیں
سار	طرح	سٹیا۔سٹنا	پھینکا۔گرایا۔چھوڑا	ہیچ	ہی	جنے	لوگ۔آدمی
ستی	سے	سدھ سٹنا	ہوش گم کرنا	اپڑتا	پہونچنا۔حاصل کرنا	وسنا	نظر آنا
رس	شوق	بھڑنگ	سادہ لوح	بھار	باہر	کیتا	کرتا
تگڑی	ترازو	وسیا۔دِسنا	نظر آنا	بیگی	جلدی	گجگری	ایک قسم کا جوڑا
تجھ سار	تجھ جیسا	نکو	مت۔نہ	بھاکر	ڈال کر	لوہو	لہو۔خون

وہ عنصر جو متروک ہے۔

سوں	سے	کوں	کو	جیوں سے	جیسے	اچھایا	اٹھایا
ستی	سے	بولیا	بولا	جیوں کر	جس طرح	النگ	سمت
تجھیں	سے	لگیا	لگا	بھتر بھیتر	اندر	ان نے	اس نے
تجھے	سے	جیوں	جوں	ٹک	ذرا	انہوں کو	ان کو
منیں	میں	تجکوں	تجھ کو	اَجاناَ	انجان	مجکوں	مجھ کو
ہوں	ہیں	توں	تو	اجھوں لگ	ابھی لگ	ہمن	ہم

اسلوب بیان

ولی کے اسلوب کی سادگی اور روانی ۔ دلکشی اور موسیقیت ابلتے چشموں کی مسلسل روانی اور ترنم کو یاد دلاتی ہے ۔ اس کا بلند تخیل جب اپنے رنگین پر تول کر اڑتا ہے تو پڑھنے والو نکے تصور کو بھی لے اڑتا ہے ۔ وہ اپنے سحر آفریں اسلوب ۔ جادو بھرے الفاظ اور وجد آفریں موسیقیت سے وہ جادو جگاتا ہے کہ پرستان کی سبھا آنکھوں میں پھر جاتی ہے محبوب کے حسن و ادا کی تصویریں الفاظ میں اس کمال سے کھینچتا ہے کہ اس پر راجہ اندر کی سبھا کی نیلم پری کا دھوکا ہوتا ہے ۔

ولی کا اسلوب بیان ایک رنگیلا ساجن ہے ۔ وہ پیکر جمال ہر وقت ایک نئی پوشاک میں نظر آتا ہے ۔ اس کے سج دھج کی تمام تصویریں اس مضمون کو بے انتہا طویل کر دینگی ۔ اس لئے دو چار نمونے دکھائے جاتے ہیں ۔

اسلوب بیان مائل بہ ہندیت ۔

دلبر ادھر کوں تیرے کوثر نہ کہوں تو کیا کہوں　　میٹھے ترے لباں کوں شکر نہ کہوں تو کیا کہوں
لٹکی لٹاں میں تیرے دستی ہے مانگ موتی　　یک یک پوے بہا میں جوہر نہ کہوں تو کیا کہوں
یو نین تیرے دو نوں ٹکڑے کرے ہیں دلکوں　　ہر یک مژہ کوں اسکے خنجر نہ کہوں تو کیا کہوں

مائل بہ فارسیت ۔

گریۂ عشاق سوں خنداں ہے باغ بزم حسن　　سوز پروانہ سوں روشن ہے چراغ بزم حسن
کہوں کس سوں عزیزاں جا کہ درد یے نشانِ دل　　نہیں یک گوش محرم تا سنے آہ و فغانِ دل
لکھیا اے ظالم خونخوار و صیاد دل عاشق　　تری مژگاں نے میرے دل اُپر مضموں شاہیں کا
روبرو ہوتے ہیں اسکے حال دل ظاہر ہوا　　جلوۂ آئینہ رویاں کا شف ہر راز ہے
دردمنداں کوں سدا ہے قول مطرب دلنواز　　گرمیٔ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

بطرزِ جدید۔ شاخِ گُل ہے یا نہالِ راز ہے — سرو قد ہے یا سراپا ناز ہے
دودِ آہِ شوقِ مشتاقاں نہیں — خط نہیں یو حسن کا آغاز ہے
عشق بے تابِ جاں گدازی ہے — حسن مشتاقِ دل نوازی ہے
کیونکہ ملنا صنم کا ترک کروں — دلبری اختیار کھوئی ہے
صنم مجھ دیدۂ دل میں گزر کر — ہوا ہے باغ ہی آبِ رواں ہے
دل مست جامِ بے خودی اس انجمن میں کیوں نہ ہو — جیوں موجِ مئے ہے ہر ادا ساقی سیمیں ساق میں

یہ اور اس قبیل کے صدہا اشعار ولی کے ہاں موجود ہیں بعض غزلیں کی غزلیں جدید اسلوب اور زبان میں ہیں صرف کوں سوں وغیرہ ہوں تو ہوں۔ ایسی غزلوں کے بعض نمونے پہلے آچکے ہیں۔

ولی کا اسلوب منظر نگاری میں۔ ولی کا قلم منظر نگاری میں بھی اپنے ہم عصروں کے قلم توڑتا ہے۔ اس کی مثال وہ قصیدہ ہے جس کے چند اشعار یہ ہیں۔

ہوا ہے خلق اوپر بسکہ فصلِ سبحانی! — کیا ہے ابر نے رحمت سوں گوہر افشانی
ہر اک طرف جو ہوئی بسکہ ریزشِ باراں — کیا ہے آج تفرج نے جوشِ طوفانی
اس آب روح فزا کے کمال لطف کوں دیکھ — چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آبِ حیوانی
ہر ایک قطرۂ شبنم ہے غیرتِ گوہر — ہر ایک بات پہ برسا جو ابرِ نیسانی
تمام ملک ہوا حق کے فضل سوں آباد — رہا نہیں ہے جگت میں نشانِ ویرانی
زہے بہارِ حلاوت زہے بہارِ طرب — کہ بلبلاں نے لیا شیوۂ غزل خوانی

واقعہ نگاری میں ولی کا اسلوب۔ اس کی مثال میں صرف ایک غزل کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں

آج کی رین مجکوں خواب نہ تھا — دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا
ماہ اندھکار تھا کہ جیوں میرے — پاس میرا چو ماہتاب نہ تھا
آہ پر آہ کھینچتا تھا میں! — آج کی رات کچھ حساب نہ تھا
کیا سبب تھا کہ وہ نہیں آیا! — کہ اسے مجھ ستی حجاب نہ تھا
گر تلطف سوں آکے مل جاتا — حق کے نزدیک کچھ عذاب نہ تھا

اب ہم ولی کے کلام سے بعض ایسے شعر نقل کرتے ہیں جو اردو کے مشہور شعرا کے ہم رنگ ہیں۔

اسلوبِ ولی بطرز خسرو۔

لٹ کے پھندے میں جا پھنسا مرغ دلم بذوق خود — باز خود اس قدر چرا مضطر و بے قرار ہے
ابرو و چشم و زلف و لب خال و خط اس نگار کا — خنجر و سحر و عقرب و دانہ و دام و مار ہے

بطرز میر۔

گرچہ طناز یار جانی ہے — مایۂ عیش جاودانی ہے
تجھ سوں ہرگز جدا نہوں اے جان — جب تلک مجھ میں زندگانی ہے
مجھ کوں تجھ بن کسو سے کام نہیں — فکرِ ناموس و ننگ و نام نہیں
دیکھنے سوں خوباں کے منع مت کر اے زاہد — موسم بزرگی نئیں عالمِ جوانی ہے

بطرز غالب۔

کتابت بھیجنی ہی شمع بزم دل کوں اے کاتب — پر پروانہ او پر لکھ سخن مجھ ناتوانی کا
ترے مکھ کی صفائے حیرت افزا لکھ سکے کیونکر — قلم ہے جوہر آئینۂ نا صاف مانی کا

غضب ہے چہرۂ رنگیں بہارِ ناز و ادا بہارِ حسن میں ہے لالہ زارِ ناز و ادا
درد مندوں کو سدا ہے قولِ مطرب دل نواز گرمئ افسردہ طبعاں شعلۂ آواز ہے

ولی کا اسلوب صنعتوں کی وجہ سے بھی بہت دلچسپ ہو گیا ہے۔ یہاں ہم صرف ان صنعتوں کا ذکر کرینگے جو اس کے کلام میں زیادہ پائی جاتی ہیں۔

رعایتِ لفظی

ولی کے ہاں رعایتِ لفظی کی کمی نہیں۔ کوئی غزل ایسی نہیں جس میں ۲ دو چار یا کم از کم ایک آدھ شعر میں رعایتِ لفظی نہ ہو۔ جہاں اس کو الفاظ کو چھانٹنے اور چننے میں کمال حاصل ہے وہاں وہ ایسے الفاظ کو جو آپس میں کچھ نہ کچھ رعایت اور کنایہ رکھتے ہوں ترتیب دینے میں قدرتِ تامّہ رکھتا ہے ذیل کی غزل اُس کے اِس رجحان پر روشنی ڈالتی ہے۔

تجھ لب کی صفت لعلِ بدخشاں سوں کہونگا جادو ہے تری نین غزالاں سوں کہوں گا
تعریف ترے قد کی الف وار سری جن جا سروِ گلستاں کیں خوش الحاں سوں کہوں گا
مجھ پر نہ کرو ظلم تم اے لیلئ خوباں !! مجنوں ہوں ترا غم میں بیاباں سوں کہوں گا
دیکھا میں تجھے خواب میں اے مایۂ خوبی اس خواب کوں جا یوسفِ کنعاں سوں کہوں گا
جلتا ہوں شب و روز ترے غم میں اے ساجن یہ سوز ترا مشعلِ سوزاں سوں کہوں گا
بے صبر نہ ہو اے ولی اس درد سوں ہرگز جلتا ہوں ترا درد میں درماں سوں کہوں گا

ولی کے کلام میں اس قبیل کی صدہا غزلیں ملتی ہیں جن میں رعایتِ لفظی کے ساتھ لطافتِ زبان بھی قابلِ دید ہے

مراعات النظیر

رعایتِ لفظی کے بعد جو صنعت ولی کے کلام میں نمایاں ہے وہ مراعات النظیر ہے۔ اس نے اس صنعت میں بھی متعدد غزلیں لکھی ہیں ذیل کی غزل میں ایک آدھ شعر کو چھوڑ کر

تمام اشعار مراعات النظیر کا اچھا نمونہ ہیں۔ اس صنعت میں ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جو ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہوں جیسے ماہتاب ۔ صحن ۔ رات وغیرہ جن کا تعلق ظاہر ہے۔

اے رشکِ ماہتاب تو دل کے صحن میں آ   فرصت نہیں ہے دن کوں اگر تو رین میں آ
جیوں طفلِ اشک بھاگ نہ تو مجھ نظر ستی   اے نورِ چشم نور نمط مجھ نین میں آ
کب لگ الیس کے غنچۂ لب کوں رکھیگا بند   اے نو بہار باغ محبت سخن میں آ
تا گل کے رو سے رنگ اڑے اوس کے نمط   اے آفتابِ حسن لٹک سوں چمن میں آ
تجھ عشق سوں کیا ہے ولی دل کوں بیتِ غم   سرعت ستی اے معنیٔ بیگانہ من میں آ

چند متفرق اشعار۔

تجھ مکھ کے مصحف کے بھیتر آیت جو دیکھی قہر کی   ہیبت سوں دل زیر و زبر دل ٹوٹ سی پارہ ہوا
یاجوج ہو رقیب جو آیا سجن کے پاس   پیدا کیا حجاب سکندر رکھے سد کے تئیں
تجھ حسن آبدار کی تعریف کیا لکھوں   موتی ہوا ہے غرق تجھے دیکھ آب میں

حسن تعلیل ۔
ماہ کے سینے اوپر اے ماہ رو   داغ ہے تجھ حسن کی جھلکار کا
تجھ بھواں کے خم کوں دیکھا جب ستی اے ماہ رو   رات دن رکھتا ہے زاہد مکھ اگے محراب کوں

حسن تعلیل کہتے ہیں ایک حسین علت کے بیان کرنے کو۔ چاند کے داغ کی وجہ محبوب کے حسن کو قرار دینا اور زاہد شب زندہ دار کے محراب عبادت میں مصروف طاعت رہنے کا سبب مطلوب کے ابرو کا خیال بیان کرنا ایک حقیقت کے لئے کتنی حسین علت ہے۔

تجنیس یہ صنعت لفظی و معنوی دونوں طور پر آتی ہے۔ اس کی کئی قسمیں ہیں جن کا بیان موجب طوالت ہے۔

سویدا کی نمط جادے نہ ہرگز !! خیال اس خال کا جو دل نشیں ہے

خال اور خیال میں تجنیس زائد ہے تجنیس کے معنی ہیں ملتا جلتا ہونا چاہیے وہ بلحاظ معنی ہو یا بلحاظ الفاظ ۔

ہر مرغ دل کوں آپ بھی لاکر کرینگے بندیاں دیکھینگے گر بھر کر نظر تجھ زلف کے خدام دام
تجھ زلف نے جو دائرے باندھے صفار خسار پر دیکھے نہیں اس فتاں کے کوئی صبا اسلام لام

گل مقصد کا ہار ڈالے ہے نقد ہستی جو بار ڈالے ہے

ردّ الصّدرُ علی العجز ۔ تعریف وقت طلب ہے۔ اس کے علاوہ اس خصوص میں صدہا کتابیں موجود ہیں ۔ مصرعوں کے پہلے اور آخر کے ارکان کو الٹ دیا جاتا ہے ۔

تجھ سوں لگی ہے لگن اے گل باغ حیا اے گل باغ حیا تجھ سوں لگی ہے لگن
دستۂ گل ہے سخن سن یہ بچن اے ولی سن یہ بچن اے ولی دستۂ گل ہے سخن

حسن طلب ۔ مانگنے مانگنے میں فرق ہوتا ہے ۔ بے ڈھنگے پن سے مانگنا گدائی اور ڈھنگ سے مانگنا "حسن طلب" کہلاتا ہے ۔ ذیل کے دو شعر ملاحظہ ہوں ؎

ولی کوں اے سجن گا ہے عطا کر بھیک درشن کی دیا ہے لطف سوں تجکوں خدا نے حسن کی دولت
لب تمہارے ہیں شفا بخش ولی ہے بیمار حیف صد حیف جو اس وقت میں درماں نہ کرو

ایراد بالمثل ۔ خیر الکلام قل و دل ۔ بہترین کلام وہ ہے جو مختصر کہا جائے اور دلیل بھی لائی جائے ۔ پہلے مصرع میں دعوے اور دوسرے میں دلیل پیش کرنے کو ایراد بالمثل کہتے ہیں ۔ ولی نے اس صنعت میں قلم توڑ دیئے ہیں ۔ اپنے دعوے کو ایسی عام فہم اور سلیس دلیل سے ثابت کرتا ہے کہ چون و چرا کی گنجائش ہی نہیں رہتی ۔

تصویر ترے قد کی مصور نہ لکھ سکے ہر گز کسی نے ناز کی صورت نہیں لکھی

بے حقیقت گرمجوشی دل میں نئیں کرتی اثر
شمع روشن کیونکہ ہووے شعلۂ تصویر سوں

کیونکہ سیری ہو حسن سے تیرے
دھوپ کھانے سے پیٹ بھرتا نئیں

معشوق کوں ضرر نہیں عاشق کی آہ سوں
بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سوں چراغ گل

معرکے میں عشق کے ہر بوالہوس کا کام نئیں
دیکھ حالت کیا ہوئی منصور سے سرداری کی

تشبیہ ۔ ولی تشبیہوں کا خالق ہے اور ایسا نازک خیال خالق کہ جذبات کی تصویریں بھی اس چابک دستی سے کھینچ دیتا ہے کہ ان رنگین مرقعوں میں جان پڑجاتی ہے ۔ اس کی تشبیہیں بولتی تصویریں ہے جیسی نادر اور جیسی اچھوتی تشبیہیں ولی کے کلام میں ملتی ہیں ویسی نہ تو متقدمین کے ہاں ہیں نہ متوسطین کے پاس رہنا خرین تو زیادہ تر اس جھگڑے سے پاک ہی ہیں ۔

علماء کا قول ہے کہ تشبیہ و استعارہ کلام میں وہی مزا دے جاتا ہے جو طعام میں نمک ۔ اکثر اوقات خیال اتنا نازک اور حسین ہوتا ہے کہ اس کے اظہار میں بیسیوں صفحے لکھنے کے بعد بھی جیسی چاہئے توضیح نہیں ہوتی۔ نہ وہ حسن باقی رہتا ہے جو خیال میں تھا ۔ یا بعض خیال ایسے لطیف ہوتے ہیں کہ ان کی لطافت ہمارے تصریحی الفاظ کے ثقل کو برداشت نہیں کر سکتی ۔ ایسے نازک موقعوں پر تشبیہ کام آتی ہے اس سے خیال کا حسن و نزاکت بھی برقرار رہتی ہے اور مطلب بھی واضح ہوجاتا ہے ۔ ولی نے زبان کی بے مائیگی کی تلافی اپنی حسین تشبیہوں سے کی ہے اور خوب کی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ جدت تخیل اپنی آپ نظیر ہے ۔

اے ولی فکر صاف صاحب دل
گوہر بحر نکتہ دانی ہے

ولی کی چند حسین تشبیہیں صاحبانِ دل کے پاکیزہ مراقبہ کو نکتہ شناسی کے سمندر کا موتی کہنا کتنا لطیف کنایہ ہے ۔

۵ ایس گھر میں رقیباں کوں نہ دے بار
چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا

مطلوب کے گھر کو چمن سے اور رقیبوں کو خار وخس سے تشبیہہ دی ہے اور اس استادی سے کہ معلوم ہوتا ہے یونہیں ایک بات کہدی۔

موج دریا کی دیکھنے مت جا   دیکھ اس زلف عنبریں کی ادا

کتنی خوبصورت تشبیہہ ہے اس میں بھی وہی بات ہے جو اوپر کے شعر میں ہے ایسی تشبیہوں کو تشبیہہ اضمار کہتے ہیں جو باتوں باتوں میں وجہ تشبیہہ بتادیں اور پھر معلوم ہو کہ کچھ کہا ہی نہیں۔

دونوں بھوں کے درمیاں ٹیکا نہیں زری کا   ہے قوس کے برج میں جھلکار مشتری کا

محبوب کی کماندار ابروؤں کو قوس کے برج سے طلائی ٹیکے کو مشتری سے (جس کی روشنی زرد ہوتی ہے) اور ٹیکے کی چمک دمک کو سیارے کی درخشانی سے تشبیہہ دی ہے تخیل دیکھئے کبھی تو عرش معلی پر مشتری کو چھوآتا ہے اور کبھی سینے اور دل کی گہرائیوں میں ڈوب کر ایمان کو کھینچ لاتا ہے۔

تری یہ زلف ہے شام غریباں   جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے

کیسی اچھوتی تشبیہہ ہے۔ یوں تو شام سیاہ ہوتی ہی ہے لیکن شام غریباں غریب الوطن مسافر کی نگاہوں میں اور بھی تیرہ وتار نظر آتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ جب تیری سیاہ کاکلیں تیرے چہرے کو ڈھک لیتی ہیں تو گویا میرے لئے شام غریباں کا پیام لاتی ہیں اور جب تو انہیں سرکا کر اپنی نورانی پیشانی کھول دیتا ہے تو مجھے صبح وطن کی نوید ملتی ہے۔

لام نستعلیق کا ہے اس بت خوش خط کی زلف   ہم تو کافر ہیں اگر بندے نہ ہوں اسلام کے

اس شعر میں کئی صنعتیں ہیں۔ رعایت لفظی بھی ہے ایہام بھی ہے تجنیس زائد بھی ہے۔ مراعات النظیر بھی ہے اور تشبیہہ بھی زلف خمدار کو لام نستعلیق سے تشبیہہ دیکر حسن سے اسلام کی پناہ ڈھونڈی ہے وہ قابل داد ہے اس شعر کا لطف غور کرنے سے بڑھتا جاتا ہے۔

یوں دوستاں کے ہجر سوں داغاں ہیں سینے پر ولی　　صحرا کے دامن کے اوپر جیوں نقش پائے رہرواں

دوستوں کی جدائی کے داغوں کی شدت کو نقش پائے رہرواں سے ظاہر کرنا ولی کے قدرت تخیل کا ادنیٰ کرشمہ ہے ولی کا کلام ایسی ایسی ہزار ہا کامیاب تشبیہوں سے بھرا پڑا ہے وہ ایسا کہنہ مشق اور چابکدست فن کار ہے کہ اپنے ہر مصرع میں کوئی نہ کوئی صنعت اور کچھ نہ کچھ ندرت ایسی بے ساختگی سے کھپاتا ہے کہ آورد کو بھی آمد کر دکھاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ولی کا کلام آمد ہی آمد نظر آتا ہے۔ "سراپا" کے موضوع میں ولی کی نادر اور حسین تشبیہیں بکثرت پائی جاتی ہیں اور ان میں سے اکثر اشعار ہم نے نقل بھی کئے ہیں ذیل کی تشبیہ قابل غور ہیں۔

ولی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی!　　مرے گھر اس طرح آتا ہے جیوں سینے میں راز آئے

ذیل کی غزل میں ولی کی قادر الکلامی۔ شیریں سخنی اور تشبیہوں کی خلاقی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

مجھ دل میں بے دل کے سدا وہ دلبر جاناں بسے　　جیوں روح قالب کے بھیتر یوں مجھ منیں پنہاں بسے

پتلی میں میرے نین کی بستا ہے دلبر عین یوں!　　پردے منیں ظلمات کے جیوں چشمۂ حیواں بسے

اس دلربا دلدار کا ہے ٹھور میرے دل منیں　　یوں دل منیں رہتا ہے وہ جیوں دل منیں ایماں بسے

ہے دل مرا دریائے غم اور نقش اس لب سرخ کا　　رہتا ہے میرے دل میں یوں دریا میں جیوں مرجاں بسے

یوں دل میں میرے اے ولی بستا ہے وہ اہل شفا　　سینے منیں جیوں بید کے ہر درد کا درماں بسے

حقیقت یہ ہے کہ ولی کی تشبیہوں کی لطافت۔ نازک خیالی اور صداقت ولی کے محبوب کے حسن کی طرح "مستغنی از اوصاف ہے"۔

غزل مرقوم میں ایک نہیں بیسیوں صنعتیں ہیں۔ اس کے علاوہ بندش کی چستی مضمون کی ترتیب۔ خیالات کا تسلسل اور بے ساختگی خوبصورت الفاظ اور ان میں عمداً بھونکی ہوئی موسیقیت اور پھر اس پر آمد ہی آمد کمال ہے۔

اور ایسا کمال کہ اس پر یہ شعر صادق آتا ہے۔

تری ہر بات میں ہے اک بناوٹ   بناوٹ میں مگر اک سادہ پن ہے

ان تشبیہوں کی ندرت قابلِ داد ہے۔

تجھ نین کی کیا کروں میں تعریف   یہ عینِ ثلث کا صادِ دستا

دیکھ اے اہلِ نظر سبزۂ خط میں لبِ لعل   رنگ یاقوت چھپا ہے خطِ ریحان میں آ

لختِ دل پر خط لکھا ہوں یار کوں   داغِ دل مہرِ سرِ مکتوب ہے

غرض ولی کا کلام ایسی ایسی عدیم المثال تشبیہوں سے مملو ہے۔

تلمیح ۔ ان اشاروں کو جن سے کسی واقعہ یا قصہ کا خیال آجائے تلمیح کہتے ہیں دنیا کی ساری ترقی یافتہ زبانوں میں تلمیحیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ بڑے بڑے قصوں اور طویل طویل واقعات بیان کرنے میں جو قیمتی وقت صرف ہوتا تھا ان سے ان چھوٹے چھوٹے اشاروں نے بچا لیا ہے جیسے حسنِ یوسف۔ طوفانِ نوح وغیرہ ولی کے کلام میں تلمیحات کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ ہمارے مضمون میں اتنی گنجائش نہیں ہے کہ ان ساری تلمیحات کے واقعات کو بیان کیا جائے اور نہ اس کی ضرورت ہے کلیاتِ ولی کی صدہا تلمیحات میں سے چند یہ ہیں۔

طوفانِ نوح۔ صورِ اسرافیل۔ چشمۂ حیواں۔ جامِ جم۔ آئینۂ سکندر۔ عشقِ زلیخا۔ دیدۂ یعقوب۔ شہرِ مصر۔ محملِ لیلےٰ۔ لوحِ محفوظ۔ چاہِ کنعاں۔ قاب قوسین۔ سُبحَانَ الَّذِیٓ اَسرٰی۔ لَولَاکَ لَمَا۔ آتشِ نمرود۔ شق القمر۔ ہل اتیٰ۔ مہرِ سلیمانی۔ پردۂ ظلمات۔ ظلمِ کربلا۔ شہیدِ ظلم۔ شاہِ مرداں۔ کشن۔ لچھمن و رام۔ روزِ نہاں۔ ارجن کے بان وغیرہ وغیرہ۔ اُن تمام تلمیحات کی تصریح اور تشریح کی جائے جو ولی کے کلام میں موجود ہیں تو ایک ضخیم کتاب بن جائے۔ تاہم ایک دو ہندی صنمیات کی تلمیحات کے واقعات برادرانِ اسلام کیلئے درج کرتے ہیں

جو دھا جگت کے کیوں نہ ڈریں تجھ سوں اے سجن ترکش میں تجھ نین کے ہیں ارجن کے بان آج

ارجن راجہ پانڈو اور رانی کنتی کے بیٹے تھے۔ بچپن سے تیر اندازی کا شوق تھا جو بڑھتے بڑھتے طلب بن گیا ان کی بہادری اور تیر اندازی کی داستانیں مشہور ہیں۔ صاحب اعجاز تھے۔ جنگ میں کبھی کوتاہ قد نظر آتے کبھی بلند قامت کبھی لاغر اور کبھی فربہ کبھی اس حد پر اور کبھی اس حد پر دکھائی دیتے۔ اُن سے کوئی جیت نہ سکتا۔ چنانچہ راج کماری دروپدی کو ان کے سوا کوئی حاصل نہ کر سکا۔ وہ اپنے تیروں سے پڑتے پانی اور چلتی ہوا کو روک دیتے تھے۔ بہت سے دیوتاؤں نے ان سے خوش ہو کر ان کو اپنے ہتھیار دئے تھے۔ غصہ یا مہربان ہو کر تیروں سے مینہ یا آگ برسایا کرتے۔ بہت سے راجاؤں پر انکے احسان تھے۔ سری کرشن جی مہابھارت کی لڑائی میں ان کے رتھ بان تھے۔ ولی نے اپنے محبوب کی آنکھوں کو تیر اندازی میں ارجن کا مد مقابل کہا ہے۔ جن کے ترکش سے ایسے ہی مسلسل اور بے خطا تیر چھوٹتے ہیں جیسے ارجن کی کمان سے چھوٹتے تھے۔

ترے بن رات دن پھرتا ہوں بن بن کشن کی مانند آپس کے مکھ اُپر رکھ کر نگہ کی بانسلی انکھیاں

کشن۔ سری کرشن جی کا لقب ہے۔ آپ کی والدہ کا نام دیوکی اور والد کا نام واسدیو تھا۔ آپ راجہ کنس کے بھانجے تھے جو ان دنوں "بندرابن" کا جس کو اب متھرا کہتے ہیں حکمران تھا اور بڑا خونخوار راجہ تھا۔ نجومیوں نے کبھی کہہ دیا تھا کہ تیرا بھانجا تجھے قتل کرے گا جس پر راجہ نے سری کرشن جی کے بے گناہ ماں باپ کو دونوں قید خانہ میں رکھا اور کوشش کی کہ غریب بہن کو اولاد نہ ہونے پائے۔ لیکن مشیتِ ایزدی کے آگے کچھ نہ چلی اور انہوں نے اپنے مبارک وجود سے دنیا کو زینت بخشی کنس نے سری کرشن جی کو قتل کرنے کے لئے لاکھوں ہی جتن کئے لیکن وہ عجیب عجیب طریقوں اور

واقعات سے بچتے رہے آخر کار نجومیوں کی پیشنگوئی پوری ہوئی اور سری کرشن جی نے بڑے ہوکر کنس کو قتل کرڈالا۔

بچپن میں کشن بندرابن میں جایا کرتے اور گوپیوں گوالنوں کی لڑکیوں سے کھیلا کرتے اور جنگلی نناحوں کی بانسری بناکر بجایا کرتے۔ بانسری کے وجدانی نغموں میں وجدانی سُر ہوتے۔ انسان اور حیوان کا تو کیا ذکر جھاڑ اور پہاڑ تک بے خود ہو جاتے اور گھنٹوں بانسری کا جادو سنا کرتا۔ آپ سانولے سلونے تھے۔ ملیح چہرہ۔ متوالی چال۔ رسیلی آنکھیں اور سُریلی آواز آپ کے وہ امتیازات تھے جنہوں نے گوپیوں کو آپ کا فریفتہ کر رکھا تھا۔ صاحب اعجاز تھے۔ بھگوت گیتا آپ سے منسوب ہے جو روحانی تعلیم اور وجدانی حقائق سے مملو ہے۔

دلی نے کلی اور رام کلی میں رعایت لفظی رکھی ہے۔ کہتا ہے کہ کشن جیسا عدیم المثال موسیقی داں بھی نیزے کلی جیسے دہن کی یاد میں رام کلی (ایک راگ کا نام) بانسری پر گاتا بن بن پھرا کرتا ہے۔ (اگر کوئی ان تمام خوبصورت تلمیحوں کے واقعات کو لکھنے کی تکلیف اٹھالے تو یقیناً وہ ایک بہت ہی دلچسپ کتاب ہوگی)۔

ترکیبیں

ولی کی ترکیبیں کیا ہیں اس کے رنگین تخیل کی سب سے رنگین تصویریں ہیں۔ کلیات ولی ان گنت خوبصورت ترکیبوں سے بھرا پڑا ہے۔ کیسے ممکن تھا کہ ولی کا فلک شگاف تخیل حد شکن زبان نہ ہوتا دو سو سال قبل کی زبان میں پہلے تو شاعری کرنا ہی کرامت تھا اور پھر ایسی شاعری کھلا اعجاز ہے۔ اس کا سبزۂ تخیل اتنا تیز گام تھا کہ اس کی جولانیوں کے آگے عرصۂ زبان تنگ نظر آنے لگا۔ ولی کے اشعار میں جذبات اور تاثرات کا طوفان خیز سیلاب موجزن نظر آتا ہے اور یہی وہ زبردست سیلاب ہے جس نے زبان کی حدبندیاں توڑ پھوڑ کر ڈھیر کر دیں پھر لطف یہ ہے کہ اس کو خبر تک نہ ہوئی کہ کیا ہوا اسی طرح مستانہ وار بل کھاتا جھومتا جھامتا طوفان بدوش اور کف بہ دہن نکل گیا۔ ع

"تخیل اسکو کہتے ہیں تخیل ایسا ہوتا ہے"

زبان کی بے مائگی نے ولی سے صدہا خوبصورت تشبیہیں اور رنگین ترکیبیں بنوائیں جن میں سے چند مشتی از خروارے زینت قرطاس اور افتخار قلم ہیں۔

اضافتی ترکیبیں (۱) یہ اضافتیں ہیں تو باقاعدہ لیکن ہر ایک میں ایک خاص انداز اور انوکھا پن ہے جیسے رنگ فراغ - زنجیر جنوں - طرۂ طرار - نشۂ دیوانگی - طفل طلب - دل بے دل - حسن دلکشا - ہار ادا - مصور ناز - نگار خاموشی - وودہ زلف - زلف تابدار - کشتی چشم - کیفیت مستی - منزل شبنم - مسندِ گل - مطلع انوار - سکوت بے معنی - رحم بے جا - حاصل حسن - بیت ابرو - کوہسار خاموشی - گلدستۂ اعمال - گل فطرت - نوبہارِ ناز - نقشِ دل۔ ولی کی اضافتی ترکیبیں اس کے تخیل کی ممنون ہیں۔

یاد سری جن۔ الفت سجن۔ ناز و چھب۔ مکھ آبدار۔ غنچۂ مکھ۔ جام نین۔ ایاغ نین۔ آب نین۔ مصحف مکھ

ولی نہ صرف ترکیب اضافی میں فارسی اور عربی الفاظ کے ساتھ ہندی الفاظ کو مضاف کر دیتا ہے بلکہ ترکیب توصیفی میں بھی وہ فارسی اور ہندی الفاظ کو اس کمال سے ملاتا ہے کہ باوجود خلافِ قاعدہ ہونے کے ان کے حسن اور دلکشی سے کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ مثلاً

خوش بچن۔ نقش چرن۔ کان حسن۔ کان ملاحت وغیرہ صنم شیریں بچن۔ چھب دلنواز۔ گلدستۂ خوش باس

ولی کی اور حسین ترکیبیں:۔

مہر زرّہ پرور۔ کرم زرّہ واز۔ گلستانِ حیا۔ چمن زار ناز و ادا۔ رمز آشنائے حقیقت۔ رمز آشنا حرف دانا پسند۔ گلزار رنگ و بو۔ چمنستان ادا۔ موج بے تابیٔ دل۔ جنتِ احباب تمنا۔ قوتِ روح۔ راحتِ جان و جگر قوت دل و جان۔ پیچ و تاب زلف کا تر کیش۔ گرمی بازار حسن۔ چمن حسن پری رو۔ جامۂ دارائی۔ رنگ سلامت۔ انداز قیامت۔ سبزہ زار خاموشی۔ درد و دلِ جانِ بے قرار۔ قیدِ حلقۂ گیسوئے تابدار۔ حسن موج جوئبار۔ ہندوئے زلف پری رو۔ حسن شعلہ زا۔ شمع سربلند۔ ان ترکیبوں کی خوبی اشعار میں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

(اے رشکِ چشمۂ خضر) اپنے مکھ کی شمع دکھا
کہ ہے (بصورت ظلمات) انجمن تجھ بن

تجھ درس کا برسوں سے میں مشتاق ہوں اے بے وفا
دے (شیشۂ لب) سوں کدہی ایک (خیریت انجام جام)

(اے نورِ چشمِ عاشقاں) تیری صفت نہ کر سکے!
گر (مردمِ بینا) کو ہوں (مانندِ مژگاں) صد زباں

کیوں نہ ہو (بے تابیٔ عشاق) کا بازار گرم
ہے (نگاہِ شوخ و سرکش) (فتنۂ آخر زماں)

اے ولی گر مہرباں ہو وہ (چمن آرائے حسن)
(خاطرِ ناشاد) ہو وے (رشک گلزار جناں)

ہے تیری بات (اے نزاکتِ فہم)
(لوحِ دیباچۂ کتاب سخن)

وہ (شمع بزم ادا) برمیں کر (لباس زری) ہے آفتاب نمن (شعلہ زار آتش حسن)

(اے نوبہارِ حسن) و (گلِ باغِ جان و دل) افسوس ہے کہ تجھ میں رنگ وفا نہیں ہے

محبت میں تری اے (گوہر پاک) ہوا ہے رنگ میرا کہربائی

ولی کی پوری پوری غزلیں سراپا ترکیب ہیں جن کے تراکیب کے حسنِ بیان اور طرز زبان پر دل بار جھوم پڑتا ہے۔ جیسے

(فدائے دلبر رنگیں ادا) ہوں! (شہید شاہد گلگوں قبا) ہوں

کیا ہوں ترک نرگس کا تماشا! (طلبگارِ نگاہِ باحیا) ہوں

کیا کر عرض اس (خورشید رو) کوں تو (شاہ حسن) میں تیرا گدا ہوں

سدا رکھتا ہوں شوق اسکے سخن کا ہمیشہ (تشنۂ آب بقا) ہوں

قدم اس کے پہ رکھتا ہوں سدا سر ولی (ہم مشربِ رنگِ حنا) ہوں

۳

غضب سوں (چہرۂ رنگیں بہار ناز و ادا) (بہار حسن) میں ہے (لالہ زار ناز و ادا)

لکھا ہے (صفحۂ ایجاد) پر (مصور صنع) قلم سوں (موئے کمر) کے (نگار ناز و ادا)

(چمن طراز نزاکت) کیا ہے صنعت سوں سہی قداں کا مکاں (جوئبارِ ناز و ادا)

سنا ہوں خضر سے دل کے یہ حرف تازہ و تر (بہار سبزۂ خط) ہے (بہارِ ناز و ادا)

ولی پڑیا ہے نظر جب سوں وہ (کماں ابرو) ہزار دل سے ہوا ہوں (شکار ناز و ادا)

مکتب میں جس کے ہاتھ ادا کی کتاب ہے خوبی میں وہ (ہم سبقِ آفتاب ہے)
ظاہر ہوا ہے مجھ پہ ترے ناز سوں صنم (رنگیں بہارِ حسن) (بہارِ عتاب ہے)
(کیفیتِ بہارِ ادا) تب سوں ہے عیاں وہ (مستِ ناز) جب ستی (مستِ شراب ہے)
دیوان میں ازل کے ملے جب سوں (حسن و عشق) تب سوں (نیاز و ناز) میں باہم حساب ہے
پوشیدہ (حالِ عشق) رہے کیونکر اے ولی غماز (تارِ زلف خم پیچ و تاب ہے)

اِن اشعار میں فارسی ترکیبیں۔ عربی الفاظ اور ساتھ ہی ساتھ دکنی بول چال کا میل ملاپ قابل دید اور خط آفریں ہے۔

عالم کوں (تیغِ ناز) سوں بے جاں نکو کرو غمزے سوں اپنے (غارتِ ایماں) نکو کرو
(جمعیتِ ارزو) ہے فلاطوں کوں خم منیں زلفاں دکھا کے اسکوں پریشاں نکو کرو
(آئینہ جمالِ منور) کوں کر عیاں! (خوبانِ خود پرست) کوں حیراں نکو کرو
ہے (روزِ حشر) (روزِ مکافاتِ بر عمل) ہر اک کوں (قتلِ خنجرِ مژگاں) نکو کرو
درکار ہے نثار کوں گوہر اے عاشقاں انجھواں کوں (صرفِ گوشۂ داماں) نکو کرو

مدت سوں تجھ نگاہ کا مشتاق ہے ولی
کن نے کہا غریب پہ احسان نکو کرو

چند وہ توصیفی ترکیبیں جو ولی صرف اپنے ساجن کے لئے استعمال کرتا ہے۔ شاہِ حسن۔ شاہِ خوبریاں شاہِ ناز و ادا۔ کانِ ملاحت۔ کانِ حسن۔ کانِ ادا۔ جانِ ولی۔ پستہ لب۔ غنچہ لب۔ یاقوت لب۔ شعلہ زارِ حسن۔ چشمۂ آفتاب۔ پیو پیارے۔ پیتم پیارے۔ من موہن۔ دلکشائے بہار۔ بہارِ زندگی۔

بہار ناز و ادا۔ سرو رو ۔ چمن رو ۔ گلستاں رو ۔ خورشید رو ۔ گل رو ۔ چمن زار حیا ۔ نرگس حیا ۔ رنگین ادا مست حیا ۔ فردوس رخ ۔ لیلیٰ خوباں ۔ شیریں بچن ۔ بہشت رو ۔ خوش بچن ۔ راحت جان و جگر ۔ راحت جان عشاق وغیرہ وغیرہ۔

ان اشعار کی زبان سلاست جذبات نگاری سوز و گداز قابل تعریف ہے ۔

اس (سرو خوش ادا) کوں ہمارا سلام ہے — اس (یار بے وفا) کوں ہمارا سلام ہے
لیتا نہیں سلام ہمارا حجاب سوں — اس (صاحب حیا) کوں ہمارا سلام ہے
(ناز و ادا) سوں دلکوں مرے مبتلا کیا — اس (نازنین پیا) کوں ہمارا سلام ہے
(آرام جان و دل) ہے ولی جس کا دیکھنا — اس (جان دل رُبا) کوں ہمارا سلام ہے

ولی کی حسین ترکیبوں کے ساتھ بے انصافی ہو گی اگر ہم اس کے حسن استعمال کی بھی داد نہ دیں اشعار میں وہ اپنی نازک دل فریب ترکیبیں اس کمال سے بٹھاتا ہے اور اس طرح چسپاں کرتا ہے کہ اگر ایک ترکیب بھی اٹھائی جائے تو دوسری ترکیب اس قدر موزوں و مناسب ملنی دشوار ہو جاتی ہے ۔ معلوم ہوتا ہے کہ طلائی پھولوں میں ہیرے کی کنیاں جڑی ہیں۔

چند دیگر خصوصیتیں

ولی نے اپنے کلام کے لئے جو زبان اختیار کی ہے وہ تمثیلی ہے مثلاً اس غزل کو دیکھیں۔

اے دل سدا اس شمع پر پروانہ ہو پروانہ ہو — اس نوبہارِ حسن کا دیوانہ ہو دیوانہ ہو
اے یار گر منظور ہے تجھ آشنائی عشق کی — ہر آشنائے عقل سوں بیگانہ ہو بیگانہ ہو
میری طرف ساغر بکف آیا ہے وہ مست حیا — اے دل تکلف برطرف مستانہ ہو مستانہ ہو
میرے سخن کو مہر سے سنتا ہے وہ رنگیں ادا — اے سرگذشتِ حالِ دل افسانہ ہو افسانہ ہو
اس وقت بے بیم کی نگہہ کرتی ہے مشقِ دلبری — یہ آن غفلت کی نہیں فرزانہ ہو فرزانہ ہو
اے عقل کب لگ وہم سوں یکجا کرےگی خار وخس — آیا ہے سیلِ عاشقی ویرانہ ہو ویرانہ ہو
عالم میں تجکوں اے ولی ہے فکر جمیعت اگر — ہر دم خیالِ یار سے ہم خانہ ہو ہم خانہ ہو

ولی نے تمثیل کے پردے میں حقیقت کی رونمائی کی ہے۔ اسکی مراد شاہد حقیقی سے ہے اور سمجھانا یہ چاہتا ہے کہ جبتک عقل علت ومعلول ڈھونڈا کریگی نورِ عرفاں حاصل نہیں ہو سکتا۔ معرفت کے لئے تو بےخودی اور حیرت کی ضرورت ہے۔ علم کا اختتام حیرت کی ابتدا ہے۔ بچہ اسی چیز کو دیکھکر حیران ہوتا ہے جو اسکے سمجھ میں نہیں آتی اسی طرح عقل انسانی بھی وہیں متحیر ہوتی ہے جہاں کی کیفیات اسکے علم سے باہر ہوتی ہیں اور وہ کیفیات تصور اور خیال کی یکسوئی سے پیدا ہوتے ہیں انسانی خیال اور تخیل میں بڑی زبردست قوتیں پوشیدہ ہیں اور یہی قوتیں صوفیائے کرام کے مقدس قلوب پر رازہائے حقیقت کا انکشاف کیا کرتی ہیں اور شاہد حقیقی کی جستجو کے لئے

کیف و مستی کی ضرورت ہے نہ کہ عقل و معقولیت کی۔

۲۔ ولی ایک نہایت ہی سنجیدہ مذاق شاعر ہے وہ نہ کبھی اہل زر کی جھوٹی خوشامدیں کرتا ہے نہ لوگوں کی ہجو کرتا ہے وہ ایک جذباتی شاعر ہے فرمائشی شاعری سے کوسوں دور ہے کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ دیکھا دیکھی وہ زاہد یا رقیب پر کچھ چوٹیں چل جاتا ہے۔ زیادہ تر اُن آوازوں کا رنگ بھی جو وہ ان پر کستا ہے سنجیدہ ہوتا ہے۔ مگر کبھی کبھی عامیانہ بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے

شیخ مت گھر سوں نکل آج کہ خوباں کے حضور گول دستار تری باعث رسوائی ہے

جب کبھی شاذ و نادر وہ زبردستی اپنی افتادِ طبع کے خلاف شوخ مضامین باندھنا چاہتا ہے تو رکیک اور سوقیانہ رنگ جھلکنے لگتا ہے ان میں کا بہتر شعر یہ ہے ؎

خوب کچھ نئیں رقیب کوں لگنا ایک پاپوش خوب لگتی ہے

۳۔ ولی کے ہاں علامت فاعل نے کا استعمال بہت ہی کم ہے جس سے اس زمانے کی دکنی بول چال کا اندازہ ہوتا ہے۔

۴۔ وہ قافیہ میں ایسے الفاظ جن کے آخر میں الف ہوتا ہے۔ مثلاً ادا۔ جفا وغیرہ۔ اور ایسے الفاظ جن کے آخر میں ن غنہ ہوتا ہے جیسے حیران پریشان میں ہیں وغیرہ بہت لاتا ہے۔ تاکہ اس کے کلام میں موسیقیت پیدا ہو دو تین سو سال قبل زبان اور کلام کو موثر کرنے کے اس گر کو جاننا بھی ولی کی شخصی عظمت کو ظاہر کرتا ہے۔

اب جب کہ ولی کی شاعری کے تقریباً سارے پہلو ہمارے سامنے آچکے ہیں ہم آسانی سے ولی اسکی شاعری۔ اسکی شخصیت اور اسکی انفرادیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ ولی نے اردو زبان پر وہ احسان کیا ہے جو حشر تک یادگار رہے گا۔ خصوصاً دکن اس مبارک ہستی کو کبھی نہیں بھلا سکتا جس نے اپنے تخیل محنت۔ کاوش۔ غور و خوض جستجو و تحقیق کی بدولت دکن کی کایا پلٹ دی۔ یہ ذات قدسی صفات فرشتۂ رحمت بن کر دکن کے منظر شاعری پر

اس وقت رونما ہوی جب بساط الٹ چکی تھی ممکن ہے کہ قدرت نے اس کو لوٹی ہوئی سبھا میں اسی لئے بھیجا ہو کہ اس کا وجود سوگواران وطن کے لئے داروئے شفا بن جائے۔ وہ اس مجلس غم میں پہونچا اور عین اس وقت پہونچا جب وطن کے گوشے گوشے سے شیون وشین کی آوازیں بلند تھیں۔ اس نے اپنی شیریں زبانی سے ان کے زخمی قلوب پر پھائے رکھے۔ اپنی میٹھی میٹھی باتوں سے اُن کے آنسو پونچھے۔ اور اپنے دلفریب انداز سے اُن کے دل کچھ اس طرح موہ لئے کہ وہی مجلس غم کچھ عرصے بعد محفل نشاط بن گیا۔

ولی کے کون کون سے احسان کو گنایئے۔ یہی نہیں بلکہ اس نے وطن کے خاطر بڑے بڑے ایثار کئے۔ اس نے اپنی زبان کے ان تمام محاوروں اور اصطلاحوں کو ترک کردیا جنکو اس کی دوربیں نگاہوں نے زبانِ اردو کی ترقی کے منافی سمجھا۔ اس نے نئے نئے الفاظ بنائے۔ خوبصورت خوبصورت تشبیہیں۔ پیاری پیاری ترکیبیں ایجاد کیں۔ اس نے اپنے نایاب تخیل کے رنگین پروں کے زور سے ایسی بلند پروازی شروع کی کہ نہ صرف دکن بلکہ پورا ہندوستان اس کے پروں کے نیچے تھا۔ اس نے دنیائے شاعری میں اپنی جدتوں سے تہلکہ مچا دیا۔ میرانیس دعا مانگتے ہیں۔

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے   اقلیم سخن میرے قلمرو سے نہ جائے

اس میں شک نہیں کہ انیس کی دعا درِ اجابت تک پہونچی اور اقلیم سخن پر اس کی حکمرانی ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مسلم ہوچکی۔ لیکن احسان فراموشی ہوگی اگر دنیائے ادب اردو اقلیم سخن کے اس اولیں بادشاہ کے احسانات کو فراموش کردے جس کے کچے گھر کی بنیادوں پر انیس کی پختہ عمارت کھڑی ہوئی ہے۔

دوسو سال کے امتداد زمانہ کے بعد بھی ولی کی چست بندشیں۔ شگفتہ طرز بیان دلنشین پیرایے اور میٹھی زبان اہل ذوق کے لئے وجد آفریں ہے اور جب تک سورج اور چاند رہینگے اصحاب کمال اور

ارباب مذاق سلیم ولی کے کلام کو آنکھوں سے لگاتے رہینگے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہماری یہ مختصر کوشش بارگاہِ ولی میں نذر کئے جانے کے قابل نہیں لیکن یہ پیشکش صرف اس لئے ہے کہ ہماری آئندہ پود اس پگڈنڈی کو شاہراہ بنا سکے۔ خدا کرے کہ نونہالانِ قوم ان اکابر اور محسنان قوم کے کارناموں کو غور سے دیکھیں۔ اور ان کی نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کریں۔

این دعاء از من و از جملہ جہاں آمین باد

کلامِ وَلی اور تصوّف

از

نجم النساء بیگم
بی۔ اے (عثمانیہ)

کلامِ وَلی اور تصوّف

جملہ اقوامِ زمانہ مسئلہ توحید کے قائل ہیں کسی کو اس سے انحراف و انکار نہیں اسلام کا بھی یہی عقیدہ ہے جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی جان ہے۔ یہی مسئلہ ایسا آسان ہے کہ زبان زد عوام الناس ہے اور یہی ایسا دقیق ہے کہ خواص کی عقل اس کی تحقیق اور تصدیق کرنے میں حیران ہے چنانچہ خواص الخاص بھی اس طرح فرماتے ہیں ؎

کہ خاصاں درین رہ فرس راندہ اند　　بلا احصی از تگ فرو ماندہ اند

علم الیقین کی رو سے کلیاتِ وَلی کا مطالعہ ان رموز کا ایک بڑی حد تک انکشاف کر دیتا ہے جس کا بیان کرنا ایک دشوار امر ہے مگر اس گنج رموز کی کلید ایسی ہے کہ اس سے عقود لاینحل حل ہو جاتے ہیں دل کی تعریف عارفین نے اس طرح فرمائی ہے ؎

دل چہ باشد مطلعِ انوارِ حق　　دل چہ باشد منبعِ انوارِ حق

درحقیقت داں کہ دل شد جامِ جم　　می نماید اندرو ہر بیش و کم

دل بود مرآت وجہ ذوالجلال　　در دلِ صافی نماید حق تعال

دل مقامِ استوائے کبریاست　　دل نباشد آنکہ با کبر و ریاست

اگر دیوانِ ولی کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ معرفتِ الٰہی کا ایک دفترِ بے پایاں ہے لیکن اس سے قبل ضروری ہے کہ ہم تصوف اور خاصکر مسئلہ توحید کے متعلق چند امور تمہید کے طور پر سمجھا دیں تاکہ پھر ولی کے اشعار کے سمجھنے میں سہولت ہو اور ان کی وضاحت کے لئے ہماری تحریر میں جو اصطلاحیں مستعمل ہوں ان کا مفہوم واضح رہے ۔

مسئلہ توحید کی تعلیم رسولِ خدا صلعم نے دو جملوں میں فرمائی ہے یعنی لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ یہ کلمۂ طیبہ کے دو جز ہیں ان ہی دو جملوں میں تمام رموزِ کائنات کو حل فرما دیا ہے اور جنھیں عرفائے فارس نے "اوست"، ہمہ از اوست اور ہمہ اوست کہا ہے ۔

عارفین جن کو حکمائے الٰہی بھی کہتے ہیں فرماتے ہیں کہ جب اللہ کہا جاتا ہے تو بندہ کا ہونا بھی ضرور ہے ورنہ یہ سوال پیدا ہوگا کہ خالق کون ہے اور مخلوق کیا شئے ہے ۔ باوجود خالق اور مخلوق جدا جدا ہونے کے پھر سب کا واحد ہونا سخت مشکل ہے مگر یہ راز جملہ ہمہ اوست میں موجود ہے جو رجال اللہ سے حاصل کیا جا سکتا ہے بقول شیخ عبدالقادر جیلانیؒ یُؤْخَذُ الْعِلْمُ مِنْ اَفْوَاهِ رِجَالِ اللّٰهِ لَا مِنَ الصَّحَائِفِ وَالْكُتُبِ اسی مقولہ کو ولیؒ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے ؎

الٰہی رکھ مجھے تو خاکِ پا اہلِ معانی کا　　کہ کہتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

خالقِ حقیقی کی یوں تعریف کی جاتی ہے کہ وہ ایک ہستی مطلق ہے جس کو واجب الوجود کہتے ہیں یہ ایسی ذات ہے جو سب اشیاء پر حاوی و محیط ہے ۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ کوئی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی ۔ اس سے یہ مراد ہے کہ سب طاقتیں اور قوتیں اسی خدائے قادر کی ہیں اور مخلوقات اس کے وجود سے میدانِ شہود میں آئی ہیں ۔ اسی راز سے واقف ہونے کی نسبت سعدیؒ علیہ نے فرمایا ہے ؎

برگِ درختانِ سبز در نظر ہوشیار ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار

اسی کی تصدیق میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا بھی ایک قول ہے مَا رَأَیْتُ شَیْئًا حَتّٰی رَأَیْتُ اللّٰہَ رَبِّیْ فِیْہِ۔ یعنی میں نے کسی چیز کو نہیں دیکھا جب تک اس میں دیدارِ حق تعالیٰ نہ ہوا۔ یہ قول اوست ہمہ از وست، اور ہمہ اوست کو ظاہر کرتا ہے۔

بہرحال ذاتِ حق ایسی ہے کہ نہ تو کوئی علم غیر ہی اس کو دائرۂ فہم میں لا سکتا ہے اور نہ ہی وہ تغیر و زوال پذیر ہے بلکہ اس کو ہمیشہ کے لئے بقا ہے۔ بقا ہی فنا کا آئینہ ہے جس میں فنائیت نظر آتی ہے فنا اور بقا رموز ہیں اور ذاتِ حق اوست ہے۔ خالق ہر دو کائنات بس وہی ایک ذات ہے جو کسی سے خلق نہیں کی گئی چنانچہ اسکا گواہ سورۂ اخلاص ہے۔ اس ذات کا جلوہ اور ظہور ہم ہر شئے یعنی مخلوق میں پاتے ہیں اور یہ درجۂ ہمہ از وست ہے اور معیت جو حق اور خلق میں از ازل تا ابد قائم ہے اس کو ہمہ اوست کہتے ہیں حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے کیا خوب فرمایا ہے ؎

چشم بکشا کہ جلوۂ دلدار متجلی است از در و دیوار
کُلَّ شَیْءٍ مُّحِیْط می بینم آنکہ می بینی اش بہ نقش و نگار

اس سے یہ مراد ہے کہ خالق اور مخلوق میں باوجود علیحدہ علیحدہ ہونے کے وحدانیت موجود ہے مثلاً ایک خوشبودار پھول ہوا کو اور دماغ کو معطر کر دیتا ہے مگر خوشبو پھول کی ذات سے علیحدہ نہیں یعنی پھول میں موجود ہوتے ہوئے دماغ اور ہوا میں بھی سرایت کر گئی ہے جس سے انفکاک لازم نہیں آتا ایسے ہی خالق حقیقی کی تعریف یعنی اَلْآنَ کَمَا کَانَ ہے اور اس کی معیت کسی حال میں ذات سے منفک نہیں ہوتی بلکہ جزء ولاینفک ہے۔ یہ شعر نہایت خوبی سے اس مطلب کو واضح کر دیتا ہے ؎

خدا بندہ میں آکر یوں نہاں ہے	کہ جوں بو گل کی گل کے درمیاں ہے

تعینات و تنزلات و عروج یہ اصطلاحیں صوفیائے کرام کے ہاں استعمال ہوتی ہیں جو عام فہم نہیں ذاتِ قدیم معہ صفات اپنے مرتبہ قدیم یعنی باطن میں قائم رہکر مرتبہ ثانی یعنی ظاہر میں معہ ذات و صفات خود ظہور کرے تو اس کو نزول کہتے ہیں یا اس طرح کہئے کہ ایک شئے اول اپنے جس مرتبہ پر ہو اسی مرتبہ پر باوصافِ قدیم رہ کر دوسرے مرتبہ پر بلا انفکاک ظہور کرے۔

موجودات کی جس قدر شکلیں اور صورتیں ہیں اسی ذات کی معلومات ہیں جن کو اعیان ثابتہ سے خطاب کیا جاتا ہے۔ ان کا عدم سے وجود میں آنا ہی راز ہے۔ مثلاً ہم اپنی معلومات یعنی حروف کو جو ہمارے علم یعنی باطن میں موجود ہیں ظاہر میں لانا چاہتے ہیں تو ہم ان کو خاص شکلوں میں ان حروف کے جو بصورت مقیّدہ (تعین) ہیں سیاہی کے ذریعے سے صفحۂ قرطاس پر عالم ظہور میں لاتے ہیں جو ہو بہو ہم شکل حروف باطن کے ہوں گے۔ انہیں حروف کو ہم ظاہری آنکھ سے دیکھ سکتے ہیں۔ بونکہ خارج میں بشکل کثیف نمایاں ہیں مگر باطن عالم میں وہی حروف لطافت کے لباس میں ہیں جنھیں دیکھنے کے لئے دوسری نظر کی ضرورت ہے علاوہ ازیں یہ امر محتاج انکشاف ہے کہ مرتبۂ قدیم میں لطافت موجود رہکر مرتبۂ ثانی میں بھی معہ کثافت بلا انفکاک موجود ہیں۔ یہی رموز دریافت طلب ہیں حروف باطن کیا ہیں اور حروف ظاہر کیا اور سیاہی جو حروف میں سراپا ساری و جاری ہے وہ شئے ہے۔

دوسری مثال ۔فرض کیجئے پانی ایک بسیط شئے ہے اور موصوف بہمہ صفات (حکمائے سلف) پانی کو بسیط کہا اور حکمائے جدید نے اس کو مرکب مانا ہے بہر حال اس سے ہمیں یہاں کوئی بحث

نہیں) اب اس کے تنزل کو ملاحظہ فرمائیے کہ کتنی شکلوں میں تنزل ہو رہا ہے مثلاً دریا میں پانی اپنی قدیم حالت پر ہے اور وہ حرارتِ آفتاب کی وجہ سے بخارات میں تبدیل ہو کر صعود کرتا ہے اور طبقۂ زمہریر میں پہنچکر بارش کی شکل میں زمین پر برستا ہے اور سبزہ زار و نباتات کو سرسبز کرتے ہوئے ندی اور نالوں میں بہتے ہوئے اسی دریا میں جا ملتا ہے جہاں اس کا مرکز ہے اس قدر مراتب عروج و نزول طے کرنے کے باوجود اس کی ذات میں کوئی نقص نہیں پیدا ہوا حالانکہ حالتِ تنزل میں پانی نے اپنے کئی نام بدلے کہیں بخار کہلا یا کہیں قطرہ اور کہیں بارش وغیرہ۔

تیسری مثال جب کوئی شئے ادنیٰ درجہ کی صورت اختیار کرتی ہے تو تنزل کہلاتی ہے اور اگر اعلیٰ درجہ کی شکل قبول کرلے تو عروج۔ مگر اعلیٰ اور ادنیٰ یہ دو الفاظ ایک ہی شئے کی دو حالتوں پر مبنی ہیں اور انہیں مدارج اور صفات کہنا چاہیئے صرف ہمارے خیال اور گمان کے لحاظ سے یہ ادنیٰ اور اعلیٰ سمجھے جاتے ہیں صرف تمیز کے لئے یہ دو الفاظ وضع کئے گئے ہیں۔ اسی طرح اللہ کی دو تجلیات ہیں ایک جلالی اور دوسری جمالی اسمائے قہاری جلال سے متعلق ہیں اور اسمائے رحیمی جمال سے ظاہر ہیں اشخاص اکثر اس میں توہمات اور تقلید سے کام لیا کرتے ہیں اور اہلِ باطن و محقق تحقیق اور تصدیق سے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو شرعاً یہ نہ کہا جاتا خیرہ و شرہ من اللّٰہ تعالیٰ۔ یہاں زبان سے کام نہیں لیا جاتا صرف دانش و بینش صدق و صفا یعنی ایمان اور ایقان سے کام لیا جاتا ہے۔

اگر شر کو برا کہا جائے تو ذاتِ باری پر نقص لازم آتا ہے صوفیائے کرام ان سب باتوں سے بچکر کام لیا کرتے ہیں تاکہ شریعت قرآن و حدیث کے خلاف نہو۔ سچ کہا ہے ؎

مکن با صوفیان خام یاری — کہ باشد کار خامان خام کاری

اسی مسئلہ وحدت الوجود کے سلسلہ میں ہم صوفیوں کے ہاں اور بھی اصطلاحیں پاتے ہیں جن کے مدارج طے کرنے پر وہ محقق موحد اور صوفی کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہیں ان کے نام حسب ذیل ہیں

پہلی منزل ناسوت۔ یہ عالم اجسام ہے یعنی یہ ہمارے موجود اور محسوس نظر آنے والے عالم کا نام ہے اس کو عالم شہادت بھی کہتے ہیں اور جو کچھ کام کیا جاتا ہے وہ زبان اور اعضائے ظاہری کے افعال سے اتمام پاتا ہے۔ ذکر جلی اللہ کا نام زبان سے ادا کرنے کو کہتے ہیں۔

دوسری منزل ملکوت۔ عالم ظاہر کے بطون کو عالم ملکوت کہتے ہیں اور یہ عالم ارواح ہے عالم ناسوت سے عالم ملکوت کو عروج ہوتا ہے اور اس کو قلب کہتے ہیں شغل اور اذکار اسی قلب سے ادا کئے جاتے ہیں قلب، کی تعریف ہم نے قبل ازیں کر دی ہے ذکر قلبی اسی کو کہتے ہیں۔

تیسری منزل جبروت کہلاتی ہے۔ جو ناسوت کا تیسرا درجہ ہے اور عالم جلال الٰہی بھی کہلاتا ہے جہاں اس کی صفات کا اظہار ہوتا ہے اور وہ دیکھی جاتی ہیں یہ ذکر روحی کہلاتا ہے یہاں دل اور زبان کا کچھ کام نہیں۔ فقط معائنہ ہی معائنہ ہے اور روح کا کام ہے۔

چوتھی منزل لاہوت ہے جو عالم ذات الٰہی ہے جس میں انسان فنا فی اللہ ہو جاتا ہے۔ اس عالم میں جبروت کے باطن کا اظہار ہوتا ہے۔ انسان کو یہاں اپنی حقیقت تعین کا صرف حس رہتا ہے ورنہ ذات الوہیت کے سوا کچھ اور باقی نہیں رہتا اور یہ ذکر سرّی ہے۔

پانچویں منزل ہاہوت ہے۔ اس عالم میں نہ اپنی خبر رہتی ہے اور نہ کسی کا حس باقی رہتا ہے گویا یہ راہ تصوف کی آخری منزل ہے جہاں انسان اپنی خودی کو بھی بھول جاتا ہے۔ یہ مقام تقرب ہے اور اس کو ذکر اخفی کہتے ہیں اسی کو مولانائے روم نے یوں فرمایا ہے۔

قرب نے بالا و پستی رفتن است قربِ حق از قیدِ ہستی رستن است

یہ منازل انسان کو اپنے ہی میں طے کرنے چاہئیں یہ آسمان پر نہیں ہیں جیسا کہ عوام الناس کا خیال ہے ان مسائل سے بخوبی واقفیت حاصل ہوجائے تو اس کو علم الیقین کہتے ہیں اور اس پر عمل پیرا ہونے سے حال اور کیفیت وجدانی حاصل ہوتی ہے اور یہ اللہ جل شانہٗ کا فضل ہے یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔

اس موقع پر یہ بھی بیان کر دینا بیجا نہ ہوگا کہ شیخ سعدیؒ علیہ نے ایک تمثیلی حکایت کے ذریعہ وحدت الوجود کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے کسی نے جگنو سے پوچھا کہ تم دن کو باہر کیوں نہیں نکلتے اس نے جواب دیا کہ میں تو رات اور دن ایک ہی جگہ رہتا ہوں لیکن آفتاب کی روشنی میں کسی کو دکھائی نہیں دیتا۔ اس حکایت سے مطلب یہ ہے کہ تمام عالم کا یہی حال ہے کہ خداوند تعالیٰ کی ہستی کے مقابلہ میں کسی شئے کی ہستی نہیں ہے اور یہ بات عوام الناس کی سمجھ سے خارج ہے کہ خدا اور بندہ دو ذات جدا جدا ہیں جن میں غیریت حقیقی ہے مگر جدائی کے باوجود یکتائی ہے ؎

چو سلطانِ عزت علم در کشد جہاں سر بجیب عدم در کشد

مگر حقیقت میں خدا کے سوا کوئی اور دوسرا موجود ہی نہیں جو کچھ موجود ہے سب ذاتِ باری ہے یہ مسئلہ ہمہ اوست ہے۔

مسئلہ وحدت الوجود کے ماننے کے لئے پہلے ہمیں علم الیقین کی ضرورت ہے یعنی یہ معلوم کریں کہ وجود ایک اور ذات دو ہیں یعنے ایک ذات خدائے پاک کی اور دوسری مخلوق کی۔ خدا کی ذات تو واجب الوجود ہے اور ذاتِ خلق عدم قابل الوجود یعنی وجود اضافی اور اس کو ممکن الوجود بھی کہتے ہیں

ہمیں اس کا علم ہے کہ ہر ایک ذات اپنے خاص خاص صفات رکھتی ہے چنانچہ ذاتِ خداوندی ذاتِ واجب الوجود ہونے کے لحاظ سے صفاتِ وجودی سے ہمیشہ متصف رہے گی۔ حی[1]۔ علیم[2]۔ حلیم[3]۔ سمیع[4]۔ بصیر[5]۔ قدیر[6]۔ مرید[7]۔ یہ سب وجودی صفات ہیں اور ان کو سبعہ صفات بھی کہتے ہیں۔

اب صفاتِ خلق پر نظر ڈالیے جو کہ عدم قابل وجود ہونے کی وجہ سے اسی قسم کے صفات کی حامل ہے مثلاً حی۔ علیم۔ حلیم کے مقابل میت۔ جاہل اور ابکم وغیرہ۔ اگر صفاتِ وجودی حی۔ علیم اور بصیر وغیرہ خدا کی صفات ہیں تو پھر ان عدمی صفات جاہل۔ ابکم وغیرہ سے کون موصوف کیا جائے گا؟ اگر ہم خدا کی ہی ایک ذات کو مانیں اور خلق کی دوسری ذات کی صفت کو نہ مانیں تو پھر عدمی صفات کس کی ذات سے منسوب کی جاسکتی ہیں اور صفت بغیر موصوف کے کیسے قائم ہوسکتی ہے؟ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ ضروری تھا کہ عدمی صفات خلق کی ذات کے ساتھ منسوب کی جائیں اور اسی کو موردِ الزام گردانا جائے ورنہ ذاتِ خداوندی سب عیوب و نقائص سے بری مانی جاتی ہے۔ بالآخر وجود ایک اور ذات دو ہیں اس کو ہمیں بلا چون و چرا تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اسی مسئلہ کو ثابت کرنے کے لئے مولانائے روم نے ایک نہایت پاکیزہ اور فلسفیانہ شعر کہا ہے ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ زندہ معشوق است و عاشق پردۂ

معشوق سے مراد انہوں نے ذاتِ حق کو لیا ہے اور عاشق سے محمدؐ یعنی بندہ اور ساری خلق کو اس کا مطلب یہ ہے کہ سوائے ذاتِ خدا کے سب کو زوال اور موت ہے اور پھر دوسری بات یہ ہے کہ دنیا میں سارا وجود خدا ہی کا ہے کوئی شئے بذاتِ خود موجود نہیں۔ ذاتِ خلق جو ایک رمز ہے پردہ بنکر ذاتِ خداوندی کی پردہ داری کر رہی ہے اسی کو حافظ شیرازی نے یوں فرمایا ہے ؎

دریں پردہ چو طوطی صفتم داشتہ اند   آنچہ استادِ ازل گفت بگن آں کردم

مگر جب یہ پردہ درمیان سے اُٹھ جائے گا تو بس سب ایک ہی ایک ہے بقول جامی ؎

بخدا غیرِ خدا در دو جہاں چیزے نیست   کہ بجز وہم وگماں نام ونشاں چیزے نیست

چند محجوب نشینی بگمان دگران   خیمہ در کوئے یقین زن کہ گماں چیزے نیست

یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ وہ پردہ کیا ہے اور حق وخلق میں ارتباط کس طرح ہے۔ قابلِ غور معمّہ یہ ہے کہ اگر وہ ارتباط جدا ہوا تو خلق کا قیام ہی نہ رہے گا۔

اسی معمّہ کو ایک عام فہم مثال کے ذریعہ یوں حل کیا جا سکتا ہے سینما کی مشین اور پردۂ سینما پر غور کیجئے پردۂ سینما پر ہم سب تصاویر کے عکس دیکھتے ہیں اور مشین جو ہمارے پیچھے ہوتی ہے اُس کی طرف ہمارا خیال بالکل نہیں جاتا۔ مگر جب پردۂ سینما ہٹا لیا جائے تو پھر ہماری توجہ اِس مشین کی طرف منعطف ہو جائے گی اور ہم غور کرنے لگیں گے کہ وہ کیا چیز تھی جس کے ذریعہ ہم سب کچھ دیکھ کر محظوظ ہو رہے تھے۔ اب ہم پر مشین سے پردۂ سینما تک تمام انکشافات ہو گئے پردۂ سینما گویا مشین کی پردہ داری کر رہا تھا۔ یہی حال ذاتِ خلق کا ذاتِ خالق کے ساتھ ہے جب ذاتِ خلق درمیان سے ہٹ جاتی ہے تو ہر طرف ذاتِ خالق کا ہی ظہور ہوتا ہے اب ہم اس ضروری تمہید کو ختم کر کے اصل مطلب کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔

ولی کے نام مقام اور تاریخ پیدائش ووفات میں ابھی تک اختلاف باقی ہے لیکن ہمیں ذیلی امور پر بحث کرنا نہیں ہے کیونکہ مختلف ذرائع سے ایک نہ ایک روز ان کا پتہ چل ہی جائے گا۔ ہمارا موضوع بہت اہم ہے کیونکہ ہمیں "کس نے کہاں سے زیادہ کیا کہا" سے بحث ہے اور ہم یہ چاہتے ہیں کہ ولی کے کلام میں تصوف

کے عنصر کو پیش کر کے ظاہر ہیں حضرات کو اس امر کی طرف متوجہ کریں کہ ولی ایک اہل اللہ اور صوفی سمجھکر انکے کلام کا مطالعہ کریں

ولی اورنگ آبادی کی زندگی کا بڑا حصہ گجرات کی ایک مشہور خانقاہ میں گزرا۔ اور وہیں انہوں نے دینی اور دنیوی تعلیم بھی حاصل کی تھی وہ جس زمانہ میں پیدا ہوئے اس وقت تصوّف کا نہایت زور و شور سے چرچا تھا اور ہر طرف صوفیائے کرام کی قدر و منزلت تھی۔ چنانچہ ولی نے بھی شاہ نورالدین سے جو ایک صوفی کامل تھے بیعت کی تھی اور انہیں کے معتقد تھے ان حالات کے پیش نظر ہوتے ہوئے یہ ممکن تھا کہ ولی کے کلام میں تصوف کی چاشنی نہ ہو۔ اگر نظر غائر سے دیکھا جائے تو انکا پورا کلیات اسی رنگ میں ہے ان کے اکثر و بیشتر اشعار میں تصوف اور خاصکر وحدت الوجود کے نظریہ کی شہادتیں موجود ہیں انہوں نے اپنی ایک مخمس میں توصاف وحدت الوجود کی تلقین کی ہے اور یہ بتلایا ہے کہ کس طرح انسان اس کو حاصل کر سکتا ہے اور وہ مخمس یہ ہے۔

مشق کر اے دل سدا تجرید کی — عاشقی ہے ابتدا توحید کی
ترک مت کر گفتگو تفرید کی — جس کو لذت ہے سجن کے دید کی

تجرید کائنات میں زوائد یعنی اضافات کو چھوڑ کر صرف ذات خدا کو دیکھنا۔ التوحید اسقاط الاضافات۔ نقش و نگار یعنی اپنی خودی اور دوئی کو دور کر کے حق کا معائنہ کرنا۔

تفرید۔ غیر حق کو نظر سے دور کرنا اور حق کو حق سے دیکھنا من عرف نفسہ فقد عرف ربہ۔ اور پھر دوسرا یہ ہے کہ تفکروا فی آیات اللہ یعنے اس کو دیکھنے کے لئے اپنی ہستی کو فنا کرنا ضروری ہے۔

مذکورہ بالا اشعار کا یہ مطلب ہوا کہ جو شخص تصوف سیکھنا اور جاننا چاہے تو اس کو چاہیئے کہ

خدا کی وحدانیت پر یقین لائے اور ہر چیز میں اسی کا جلوہ دیکھنے کی مشق کرے یعنی یہ کہ کوئی چیز سوائے اس کی ذات پاک کے نہیں ہے اور کہتا ہے کہ عاشقی خواہ وہ مجازی ہو یا حقیقی توحید کی ابتدا ہوتی ہے۔ اس مخمس کے دوسرے اشعار بھی اسی طرح تصوف کے مطالب سے معمور ہیں مثلاً ؎

اشعار ذیل ملاحظہ ہوں۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حُسنِ بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوا ہے مجھکو شمعِ بزم یکرنگی سوں یوں روشن
کہ ہر ذرّے اُپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

ان اشعار کے ذریعہ بھی پہلے کی طرح ذات خدا کی تجلیات کے جلوے ہر شے میں بتائے جارہے ہیں یعنی وہی مسئلہ اوست' از وست اور ہمہ اوست کو انہوں نے یہاں بھی صاف کر دکھایا ہے مطلب شعر اول۔ عالم کی ہر تجلی حسن میں بغیر حجاب کے تجلی خدا رونما ہے مگر دید کامل نہ ہونے کی وجہ سے وہ نقاب میں پوشیدہ ہے۔
مطلب شعر دوم۔ شمع کی روشنی سے جب بزم روشن ہوتی ہے تو سب پر ایک ہی روشنی ہوا کرتی ہے اور اس سے اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہر ذرّہ آفتاب وجود کے پرتو سے منوّر ہے۔

غفلت میں اپنا وقت نہ کھو ہوشیار ہو
کب تک رہیگا خواب میں بیدار ہو بیدار ہو

گر دیکھنا ہے مدعا اس شاہد معنی کا رو
ظاہر پرستاں سوں سدا بیزار ہو بیزار ہو

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ خدا کا اگر دیدار اور اس کا جلوہ دیکھنا منظور ہو تو اس ظاہر پرستی کو چھوڑ کر حقیقت کی طرف رجوع ہو اور ہر شئے میں اسی کا جلوہ دیکھنے کی کوشش کرو سب کچھ نظر

آجاتا ہے۔ ورنہ زندگی کو صرف یوں ہی ظاہر پرستی اور مادّی چیزوں میں گزار دینا غفلت ہے جس سے انسان کو جلد چونکنا چاہیئے۔

سجن کے باج عالم میں دِگر نئیں — نہیں ہیں ہے و لے ہم کو خبر نئیں
عجب ہمّت ہے اس کی جس کو جگ میں — بغیر از یار دوجے پہ نظر نئیں
ایس کے مدعا کے آشیاں کون — نہ پہنچے جب تلک ہمّت کے پر نئیں
نہ پوچھو درد کی بے دردسوں بات — کہے کیا بے خبر جس کو خبر نئیں

اول الذکر شعر کے پہلے مصرعہ کا مطلب اس آیت سے صاف ہوجاتا ہے وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ مُّحِیۡطٌ اور اُسی کے دوسرے مصرعہ کا اس آیت سے مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ۔

بہرحال کل اشعار کا مطلب یہ ہے کہ سب چیزوں میں خدا کا جلوہ ہے مگر چونکہ ہم چشم ظاہر بین سے اس کو دیکھنا چاہتے ہیں اس لئے نہیں دیکھ سکتے نہایت ہی باہمت ہے وہ شخص جو ہر شئے میں اسی کی شان دیکھتا ہے جو ہمت سے کام نہ لے گا کبھی اس راز کو نہ پائے گا آخر میں ولیؔ علیہ فرماتے ہیں کہ اگر اس معمّہ کا حل چاہتے ہو تو کسی اہل دل ہی کو تلاش کرو ورنہ جو اس مسلک سے ناواقف ہے وہ بھلا کہاں راہ بتلا سکتا ہے۔

قبل ازیں یہ بیان کیا گیا ہے کہ کلامِ حضرت ولیؔ کا اکثر حصہ تصوّف میں رنگا ہوا ہے دراس خصوصیت کی جھلکیں انہیں کو واضح نظر آتی ہیں جن کا جام قلب علم سینہ (لدنی) کی شراب سے لبریز ہو یہ بھی بیان کیا جاچکا ہے کہ توحید کا دار و مدار کلمۂ طیبہ پر منحصر ہے جس کی تعلیم حضور سرورِ

کائنات رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف دو ہی جملوں میں فرمائی ہے یعنے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ اور مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ صوفیائے کرام کے ہاں جملۂ اول کو تنزیہ کہا جاتا ہے اور ثانی کو تشبیہ اور انہیں دو اصطلاحوں کو متعدد الفاظ سے بھی نامزد کیا جاتا ہے مثلاً جمع۔ فرق۔ عینیت غیریت اور ان دونوں کو ایک کرنے کے لئے جمع الجمع کہا گیا ہے ان رموز کو مولانا جامیؒ نے "لوائح" میں اس طرح ادا فرمایا ہے۔ رباعی

همسایه و همنشین و همراه همه اوست　　در دلق گدائی و اطلس شه همه اوست
در انجمن فرق و نهانخانهٔ جمع　　باللّٰه همه اوست و ثم باللّٰه همه اوست

ولیؔ نے اسی خیال کو دوسرے پیرایہ میں اس طرح ادا کیا ہے ؎

گزر ہے تجھ طرف ہر بوالہوس کا　　ہوا دھا وا مٹھائی پر مگس کا

اس شعر میں دو جز بتائے گئے ہیں ذات خدا و ذات بندہ جس کو جمع فرق کہتے ہیں یا وجود جدا ہونے کے ان دونوں کو ایک جاننا مرتبۂ جمع الجمع ہے۔ ان عقدوں کو مرشد کامل اور رہبر حق سے ہی حل کر سکتے ہیں یہ قال صحیح ہے اور اسی میں حال ہے۔ "تجھ" ضمیر ہے جو معشوق حقیقی سے خطاب کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔ بوالہوس عاشق سے مراد ہے اس سے مراد ہے کہ ہر بوالہوس تجھکو حاصل کرنا چاہتا ہے مگر یہ کام بوالہوسوں کا نہیں۔

سرمدؔ نے اسی مضمون کو ایک اور پیرایہ میں ادا فرمایا ہے رُباعی

سرمد غم عشق بوالهوس را ندهند　　سوز پر پروانه مگس را ندهند
عمرے باید که یار آید بکنار　　این دولت سرمد همه کس را ندهند

ولی کی اسی غزل کا دوسرا شعر یہ ہے ؎

ایس گھر میں رقیباں کو نہ دے بار　　چمن میں کام کیا ہے خار و خس کا

فرماتے ہیں اپنے گھر یعنی دل میں غیروں کا کیا کام ہے چمن (دل) میں خس و خاشاک کا کام نہیں یعنی غیریت کی ضرورت نہیں اس شعر میں انتہائی نازک خیالی ہے شاعر نے مذکورۂ بالا اصطلاحوں کی توضیح کی ہے۔

نگہ سوں تیری ڈرتے ہیں نظرباز　　سداں ہے خوف دُزداں کوں عسس کا

مطلب یہ ہے کہ تیری نظر ایسی ہے کہ ہر نظرباز اس سے ڈرتا ہے کیوں کہ تیری نگہ کوتوال کے مانند ہے جو چوروں کو گرفتار کرتا ہے جہاں تیری نظر سے لڑی وہ فوراً گرفتار ہوگیا اثرِ نگہ سے وہ اپنی خودی کو کھو کر خود لِقَاءِ اللّٰہ ہو جاتا ہے۔ شعر نہایت ہی نازک اور بلیغ ہے۔ اس شعر میں بھی وہی قانون مافوق جاری ہے۔

بجز رنگین ادا دوجے سوں مت مِل　　اگر مشتاق ہے تو رنگ و رس کا

فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات جامع جمیع صفات ہے جس کو رنگین کہا ہے اس لئے اپنے یار کو ہر رنگ میں دیکھا کر یعنے تشبیہ میں دیکھ کیونکہ تنزیہ میں صورت ہے نہ رنگ بلکہ وہ منزہ ہے تشبیہ ہی میں اس کے کمالات اور صفات ہیں۔ اگر تو اس کے لقا کا مشتاق ہے تو تشبیہ ہی میں اس کو دیکھا کر

ولی کوں ٹک دکھا صورت ایس کی　　کھڑا ہے منتظر تیرے درس کا

اس میں مراتب جمع فرق کو بتا کر لقائے محبوب کو دیکھنے کا اشتیاق ظاہر فرمایا ہے یہاں یہ جان لینا ضروری ہے کہ جملہ علوم جو آج تک اس روئے زمین پر موجود ہیں ان علوم کی اصطلاحات

بھی جداگانہ ہوا کرتی ہیں اور اصول بھی مختلف۔ اگر ہمیں ان کے تمام اصول اور مسائل سے واقفیت نہ ہو تو اس کے پڑھنے سے کیا فائدہ حاصل ہو سکتا ہے اسی طرح علم تصوف کے اصول بھی اصطلاحات، قواعد، حقائق اور معارف پر مبنی ہیں اور ان سے پوری طرح واقف ہونا اہم اور لابدی امر ہے۔ یہ علم نکات، دقائق اور معارف پر مبنی ہے۔ صوفیائے کرام ان ہی نکات اور اصطلاحات کے تحت اپنے حالات اور اسرار کو بیان فرماتے ہیں تاکہ صاحبِ حال اور ہم مشرب ان سے واقف ہو جائیں۔ چنانچہ اسی طرح شعرا میں بھی اصطلاحیں ہیں جن کو صنائع و بدائع کہتے ہیں یعنی شعرا سیدھی سادی بات کو پردے میں بیان کرتے ہیں اور شاعری میں اشارات اور کنایات سے کام لیا جاتا ہے جس سے اہلِ علم اور اربابِ فطنت ہی بہرہ ور ہوتے ہیں چنانچہ غالبؔ نے اسی بارے میں کیا خوب لکھا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

جب کلامِ شعرا میں اصطلاحات اور قواعدِ تصوف بھی شامل ہو جائیں تو مطلب نکالنے میں بڑی دقت کا سامنا ہو جاتا ہے ظاہر پرست صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں اور اربابِ معانی باطن پر جن کو مجاز اور حقیقت کہتے ہیں۔ یہ کام انہیں اہلِ باطن اور نظر بازوں کا ہے جو ہر دو پہلو لئے ہوئے ہوتے ہیں۔ عشقِ حقیقی اور مجازی ان کے پاس بہ لحاظ قانونِ جمع الجمع ایک ہی سمجھے جاتے ہیں ہر شخص کو بلحاظ اپنے علم و استعداد کے مطلب ظاہری مفہوم ہوتا ہے۔

ان مسائل دقیقہ کو اگر جذبِ شوق رہنما ہوا اور عالمِ حقیقی سے امداد مل جائے تو حسبِ قابلیت و استعداد کچھ بیان کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم دیوانِ ولیؔ کے چند اشعار درج کرتے ہیں جو

رنگِ توحید میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ وَلی دراصل اسم بامسمیٰ ہی ہیں۔ یہ تخیلات اور جذبات جو ان کے اشعار میں جھلک رہے ہیں کیا تقربِ خداوندی کا پتہ نہیں دیتے؟ اشعار ذیل ملاحظہ ہوں

کہتا ہوں تیرے ناؤں کوں میں وِردِ زباں کا کیتا ہوں ترے شکر کوں عنوان بیاں کا

وَلی کا یہ شعر مصداق اقرار باللسان و تصدیق بالقلب کے ہے یعنی زبان سے اللہ ایک ہے کہنا توحید یعنی اسلام ہے اور دل سے تصدیق کرنا ایمان۔ زبان سے کہنا فعلِ نفس ہے اور دل سے جاننا فعلِ قلب۔ اسلام کے لئے صرف زبان سے اقرار کرنا ضرور ہے اس لئے حدیث شریف ہے مَنْ قَالَ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ فَھُوَ دَخَلَ الْجَنَّۃَ مطلب یہ کہ جس نے زبان سے صرف جملۂ اول کہا پس وہ داخلِ جنت ہوگیا۔

یہ بات نہایت ہی قابلِ غور ہے مگر مومن کے لئے زبان سے کہنا اور دل سے تصدیق کرنا لابدی امر ہے۔ وَلی نے ان دو الفاظ یعنی اقرار اور تصدیق کو دوسرے لفظوں میں ارشاد فرمایا ہے یعنی وِرد اور شکر کیونکہ زبان سے ورد ہوا کرتا ہے اور شکر قلب سے۔ جیسا کہ "شکریہ اور تہ دل سے شکریہ" میں فرق ہے ایک تو صرف لفظی ہوا دوسرا دل سے۔ یعنے قلب سے یاد رہے کہ صرف زبانی جمع خرچ قابلِ تسلیم نہیں اسی طرح عباداتِ الٰہی میں جبکہ صرف زبان سے سورۂ فاتحہ پڑھی جائے اور دل سے اُس کی طرف رجوع نہ ہوں تو ظاہری فرض کی ادائی ہوگئی مگر باطن سے نہیں۔ مولانائے روم کا ترجمۂ حدیث یہاں درج کیا جاتا ہے ؎

بشنو از اخبارِ آں صدرِ صدور لَا صَلٰوۃَ تَمَّ اِلَّا بِالْحُضُوْر

اسی مضمون کو ولیؔ نے مذکورۂ بالا دو مصرعوں میں ارشاد فرمایا ہے۔

زبان سے ایک کہنا اور دل سے ایک جاننا ہر دو طریق یعنی راہِ شریعت اور طریقت وقتِ واحد میں طے کرنا ہے۔ اصطلاحِ صوفیہ میں اس کو ذکرِ جلی کہتے ہیں چنانچہ حضرت کمال اللہ شاہ قدس سرہٗ فرماتے ہیں ؎

کر شغل اسمِ ذاتِ لسانی ہویا دلی کہتے ہیں اہلِ کشف یقین اسکے تیئں جلی

کلمۂ شریعت لَا مَعْبُوْدَ اِلَّا اللّٰہ ہے اور کلمۂ طریقت لَا مَقْصُوْدَ اِلَّا اللّٰہ۔ راہِ شریعت کو منزلِ ناسوت کہتے ہیں اور طریقت کو منزلِ ملکوت۔ ان ہی منازل میں اور کئی رموز ہیں جن سے عقودِ لاینحل حل ہو جاتے ہیں۔ اسی میں افراط تفریط اور اوسط ہے اور اوسط ہی کو توحید کہتے ہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اہلِ توحید و تصدیق و تحقیق افراط و تفریط سے بچکر توحید پر قائم رہتے ہیں چنانچہ حدیث شریف ہے خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا مطلب یہ ہے کہ نیکی کاموں کی اوسط میں ہے۔ ولی کا دوسرا شعر ہے ؎

جس گرد اُپر پاؤں رکھیں تیرے رسولاں اس گرد کو میں کحل کروں دیدۂ جاں کا

فرماتے ہیں کہ تیرے رسول جس گرد پر پاؤں رکھتے ہیں اس کو دیدۂ جاں کا سرمہ بناتا ہوں جب سرمہ آنکھ میں لگایا جاتا ہے تو دیدہ روشن ہو جاتا ہے اور وصف لاین جاتا رہتا ہے جس کی وجہ سے بصارت تیز ہو جاتی ہے اور نور ہی نور (اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ) نظر آتا ہے رسول سے مراد وہ ذات ہے جو راہ خدا دکھاتی ہے اور اس سے مقصد مرشد کامل ہے مولانائے روم اس مضمون کو اس طرح ارشاد فرماتے ہیں ؎

موسیِ جانِ سینہ را سینا کند طوطیانِ کور را بینا کند

گر تو سنگِ خارہ او مرمر بوی   چوں بہ صاحبدل رسی گوہر شوی

ولی   مجھ صدق طرف عدل سوں اے اہل وفا دیکھ   تجھ علم کے چہرے پہ نہیں رنگ گماں کا

چونکہ صدق کا تعلق قلب سے ہے اور یہ ایمان ہے اس لئے یہ موافق حدیث اَلْحَيَاءُ مِنَ الْاِيْمَانِ کے ہے یعنی حیا ایمان سے ہے اور ایمان حیا سے ، یہ ہر دو لازم و ملزوم ہیں فرماتے ہیں۔

اے اہل حیا (ایمان والے) میرے صدق یعنی ایمان کو دیکھ تاکہ تجھے معلوم ہو جائے کہ آیا میں اہل ایمان ہوں کہ نہیں کیونکہ یہ تیرا علم علم الیقین ہے نہ کہ گمان اسی کی وجہ سے سب تجھ پر روشن ہے سعدیؒ نے اس مضمون کو اس طرح ارشاد فرمایا ہے ؎

بدر دیقین پردہائے خیال   نماند سراپردہ الّا جلال

ولیؒ کا مذکورہ بالا شعر حدیث شریف ۔ قُلُوْبُ الْمُؤْمِنِيْنَ مِرْآتُ الْمُؤْمِنِيْنَ کے مصداق ہے اسی حدیث کا ترجمہ منشی امداد علی صاحب علوی خلیفہ حضرت سردار بیگؒ نے اس طرح کیا ہے ؎

بشر کا آئینہ ہے دل مقابل ہیں ہر اک دل کے   ملیں گے ہم اسی دل سے کہ جو جس دل سے ملتا ہے

ولی   ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشید حقیقی   یوں بوجھ کے بلبل ہوں ہر یک غنچہ دہاں کا

کہتے ہیں کہ کائنات کے ہر ذرہ میں خورشید حقیقی موجود ہے اور میں بلبل ہوں ہر ایک غنچہ دہاں یعنی معشوق کا۔ ایسا معشوق کہ اس کا منہ ایک غنچہ ہے جو اب تک ناشگفتہ ہے مگر بلبل ہونے کی وجہ سے میں اس بُو سے واقف ہوں جو اندرونِ غنچہ یعنی باطن میں موجود ہے اور اس بُو کی کیفیت اور خواص سے بھی ۔ اس مضمون کو مولانائے روم نے اس طرح بیان کیا ہے ؎

پرتو از حق است آں مشتوق نیست   خالق است آں گوئیا مخلوق نیست

ولی کے شعر سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ذرہ اور شئے ہے اور خورشید اور۔ باوجود جدا جدا ہونے کے ذرّہ میں خورشید موجود ہے ورنہ ذرّہ کبھی نظر نہیں آسکتا۔ اس سے معیت معلوم ہوتی ہے یہ شعر صوفیائے کرام کے قاعدہ تصوف کے مطابق اس طرح ہے یعنی خورشید کو جمع کہتے ہیں اور ذرّہ کو فرق کبھی خورشید ذرّہ نہیں ہوسکتا اور نہ ذرّہ خورشید۔ پھر بھی جمع و فرق بلحاظ جمع الجمع ایک ہے اور اس صورت میں ہر ذرّہ میں خورشید نے نمایاں ہوکر توحید حقیقی کو ظاہر کردیا۔ مصرعۂ ثانی بھی اسی جمع و فرق کے سانچہ میں ڈھلا ہوا ہے کسی اہل دل نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے ؎

بجز قال صحیح اے مرد عاقل   نگردد مر ترا ایں علم حاصل

زتمکین تا بہ تلوین با خبر شو   زتنزیہ تا بہ تشبیہ معتبر شو

پس آنگہ کن بیان علم توحید   دگر نہ تو شوی کافر بہ تقلید

خدا و مصطفٰے از روئے تحقیق   بہر شئے جلوہ گر بنگر بہ تصدیق

موحد را کہ وحدت در شہود ست   کہ دید و علم و ہستی یک وجود ست

صفات و ذات و عالم ہر سہ بیچون   دریں جا گم شدست عقل فلاطون

ان اشعار کا مطلب یہ ہے کہ علم تصوف کے اصول اصطلاحات تنزیہ اور تشبیہ قال اور حال اور مسائل صوفیہ سے خوب واقف ہوجا ورنہ صرف بیان کرتے وقت تقلید کرنے سے کافر ہوجائے گا۔ یعنی ہر شئے میں خدا اور مخلوق کو پہچان اور یگانگت پیدا کر۔

ولی   کیا سہم ہے آفات قیامت ستی اس کوں   کھایا ہے جو کوئی تیر تجھ ابرو کی کماں کا

فرماتے ہیں کیا خوف ہے قیامت کی آفتوں کا جب تو کمانِ ابرو یعنی معشوق کا تیر کھایا ہوا ہے اور اُس کی آفتوں کو سہہ چکا ہے۔ کیا اس سے بھی بڑھکر کوئی آفت اور ہے؟ یہ شعر "موتو قبل انتموتو" کے مصداق ہے۔ یعنی تو موت کے قبل مرجا تاکہ تو ہمیشہ زندہ رہے۔ پھر اضطراری موت آئے تو کیا کرسکتی ہے کیونکہ تو اختیاری موت سے فنا ہوکر بقا باللہ ہوگیا ہے اسی موت اختیاری کے متعلق کسی بزرگ نے کیا خوب کہا ہے ؎

رمز موتو قبل موتو بہر چیست مرگ پیش از مرگ رفع این خودیست

مرگ این بود چو جاں از تن رود بلکہ زین مرگ از تو ما و من بود

ولی جاری ہوئے آنسو مرے یوں سبزۂ خط دیکھ اے خضر قدم سیر کر اس آبِ رواں کا

فرماتے ہیں محبوب کے روئے مصفا کے اطراف سبزۂ پردہ کا کام کر رہا ہے۔ اس کو دیکھ کر میں آنسو بہا رہا ہوں کیونکہ وہ رویت کا پردہ ہوگیا اور جو صفائی پہلے تھی وہ اب باقی نہیں رہی۔ پس اے خضرِ قدم تو ان آنسوؤں کو کیا دیکھ رہا ہے آبِ رواں کی سیر کر جو حقیقت سے لبریز ہے یعنے تو جس کو آنسو سمجھ رہا ہے وہ آنسو نہیں بلکہ درحقیقت آبِ رواں ہے اس سے یہ مراد ہے کہ تو مجاز کو کیا دیکھ رہا ہے حقیقت کو دیکھ۔ چونکہ ہر شئے میں اہلِ دل کو جلوۂ یار (یعنے حقیقت) نظر آتی ہے پس یہ دو یار کو اور یار ہی کو دیکھا کر۔ مولانائے روم فرماتے ہیں ؎

زدریا موج گوناگوں برآمد ز بیچونی برنگِ چوں برآمد

ولیؔ کا یہ شعر مسئلہ تنزیہ اور تشبیہ اور تنزیہ مع التشبیہ وتشبیہ مع التنزیہ کو بتا رہا ہے

ولی کہتا ہے ولی دل ستی یو مصرعہ رنگیں ہے یاد تری مجھکو سبب راحتِ جاں کا

دل ستی کہنے سے مراد ذکرِ قلبی ہے جس کا تعلق بصیرت سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں جب دل سے تیری طرف رجوع ہو جاتا ہوں تو روح یعنی جان کو راحت ہو جاتی ہے کیونکہ ہر شئے میں تجھی کو دیکھتا ہوں۔ جان سے مراد روح ہے اور روح کا فعل دیکھنا ہے

بالآخر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ مجاز اور حقیقت باوجود جُدا ہونے کے ایک ہی ہیں یعنی بغیر حقیقت کے مجاز نہیں اور بغیر مجاز کے حقیقت نہیں۔ اسی مسئلہ کے ایک اور پہلو پر یہاں ہم مختصر طور پر چند سطور قلمبند کرتے ہیں وہ یہ کہ جب خالقِ کائنات جل مخلوقات کو عدم سے وجود میں لایا تو عدم اور وجود کیا ہیں ان کو رہبر حق ہی سے دریافت کیا جانا چاہیئے کہ جو چیز عدم ہو وہ کیونکر موجود ہو سکتی ہے؟ یہ تو ایک فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ کوئی شئے اپنی ماہیئت اور حقیقت کو بدل نہیں سکتی۔ اگر عدم موجود ہو جائے تو کیا یہ سوال پیدا نہیں ہو سکتا کہ عدم جس کو نیست کہتے ہیں وہ موجود یعنی ہست کیسے ہوا؟ جب تک یہ جملہ مراحل طے نہوں مجاز اور حقیقت میں تطابق نہیں ہو سکتا مجاز مجاز ہی رہے گا جو حقیقت سے بہت دور ہوگا

ولی کے اکثر اشعار حقیقت و معرفت کے جملہ پہلو لئے ہوئے ہیں نظرِ غائر ڈالنے سے سب شکوک و شبہات جن سے بعض اشعار کے مجازی ہونے کا خیال ہوتا ہے رفع ہو جاتے ہیں۔ اور اُن میں وہی شانِ تصوف نظر آتی ہے یہ بات دور از قیاس معلوم ہوتی ہے کہ ولی جیسی ہستی (جن کا مسلک و مشرب محض تصوف رہا ہو اور جنہوں نے اسی فضا میں تعلیم و تربیت پائی ہو) کی زبانِ قلم سے صرف ایسے اشعار نکلیں جن میں مجاز کا رنگ ہی پایا جائے۔ بہرحال بعض اشعار جو بچشمِ ظاہر بیں میں مجازی نظر آتے ہیں وہ بھی اصول و اصطلاحاتِ تصوف کے تحت آکر جامۂ حقیقت پہن لیتے ہیں۔

اس موقع پر چند اور اشعار (جو کہ مثنویات سے منتخب کئے گئے ہیں) ہم ناظرین کے ملاحظہ میں

پیش کرتے ہیں جن کے پڑھنے سے ولیؔ کا ایک صوفی کامل ہونا ثابت ہو جائے گا۔

الٰہی ! دل اُپر دے عشق کا داغ — یقیں کے نین میں سٹ کحل مازاغ

الٰہی ! عشق میں مشتاق کر مجھ — الس کے شوق کا مشتاق کر مجھ

شریعت کا جہاں ہے شارع عام — یہ تن کا دھانچہ کر آغاز و انجام

عیاں کر دل اُپر رازِ طریقت — سینے پر کھول دے بابِ حقیقت

پرکھنے معرفت کا جوہر صاف — الس کے فرض سوں کر دلکوں صراف

چمن میں شوق کے دل کھول جوں گل — اسی گل کے اُپر کر دلکوں بلبل

برہ کی بارگہ میں مجکوں جاوے — مجھے اس شوق کی عشرت سدا دے

محبت کی عطا کر مئے پرستی — الس کی معرفت کی بخش مستی

جہاں کی فکر سوں آزاد کر مجھ — الس کی یاد سوں آباد کر مجھ

مجازی کی مجالس سوں جدا رکھ — مجھے اس پینتہ سوں ناآشنا رکھ

حقیقت کی زلف کا کھول ستار — سو یک یک تار کا مجھ کر گرفتار

نظر بازان مرتبۂ الوہیت پر واضح ہو کہ یہ مضامین علم معارف سے متصف ہیں۔ مراتب احدیت و وحدت سے عبور کر کے اعیان خارجہ جس کو عالم ممکنات کائنات و مرتبۂ احدیت والوہیت کہتے ہیں اور جس میں تین عالم موجود ہیں نفس۔ دل اور روح علی التفصیل بیان کئے جاتے ہیں نفس عالم ظاہر ہے اور دل و روح متعلق بہ عالم غیب لیکن یہ سب اسی مظہر اتم یعنی انسان میں موجود ہیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے "ھُوَ مَعَکُم فَاِنَّمَا کُنتُم اَفَلَا تبصرون" مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ یعنی اللہ تمہارے ساتھ ہے

جہاں کہیں تم ہو لیکن تم نہیں دیکھتے ہو۔

چونکہ قبل ازیں تنزلات کا کچھ ذکر کر دیا گیا ہے اس لئے اب یہاں وہ قواعد درج کئے جاتے ہیں جن کو عروج کہتے ہیں اگر بنظر غور دیکھا جائے تو تنزلات عروج ہے اور عروج تنزلات۔ کسی شاعر نے کس خوبی سے اس مضمون کو ادا فرمایا ہے ؎

تنِ عریانی سے بہتر نہیں دنیا میں لباس یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہیں سیدھا اُلٹا

انسان اس جامہ میں ہے کہ کبھی الٹا سیدھا نظر آتا ہے اور کبھی سیدھا اُلٹا۔ بہرحال عروج اور تنزلات صرف مغائرت و نزاع لفظی ہے۔ ہمیشہ الفاظ لغوی بھی ہوا کرتے ہیں اور اصطلاحی بھی۔ اگر صرف بلحاظِ لغاتِ الفاظ مصطلحات کی معنی پر نظر ڈالی جائے تو وہ کبھی بھی معنوں میں موزوں نہیں ہو سکتے بلکہ مطلب فوت ہوجاتا ہے۔ چنانچہ عینیت حقیقی، اصطلاحی عین ایمان ہے اور یہی صوفیائے کرام کا مسلک اور ارشاد ہے مثلاً چاند میں دو جُز ہیں ایک نُور عارضی جس کو روشنی کہتے ہیں اور دوسرا جرم قمر جو اس کا ذاتی ہے لیکن قمر نے ضیائے خورشید کو اقتباس کیا ہے۔ پس آفتاب اور قمر ضیا میں عینیت حقیقی رکھتے ہیں لیکن اصطلاحی۔ اور اس پرتو سے آفتاب میں خلل واقع نہیں ہوتا اگر لغوی ہو تو مخل ذاتِ آفتاب ہے یعنی خورشید اور قمر ہر دو ایک ہو جائیں گے۔ پس یہاں عینیت صرف بلحاظ ضیا ہے نہ بذات۔ یہ مسئلہ نہایت دقیق اور قابل غور ہے۔ اگر اس کو اچھی طرح مفہوم کرلیں تو پھر اس مسئلہ کے سمجھنے میں ایک حد تک آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔

تعریف نفس و افعال دل و روح ۔ نفس عالم اجسام کو کہتے ہیں فعل اس کا کلام ہے اور یہ منزل ناسوت ہے قلب عالم ملکوت سے متعلق ہے اور اس کا فعل جاننا ہے۔

روح۔ اس کا تعلق عالم جبروت سے ہے اور اس کا فعل ہے دیکھنا۔ انہیں رموز کو ایک عارفِ کامل نے جن کا سلسلہ حضرت کمال اللہ شاہ قدس سرہٗ مرشد حضرت ٹیپو سلطانؒ سے جا ملتا ہے ارشاد فرمایا ہے ؎

نفس و جن کا ہے سدا اوّل سبق ہے سو وہ آثارِ حق آیاتِ حق
روح و دل کو جان افعالِ خدا کہتے امر اللہ ہیں اس کو سدا
نور و سر کو تو صفات اللہ جان ہست اور ہستی کو ذات اللہ مان

یہ اشعار اس لئے نقل کئے گئے ہیں کہ طالبانِ حق کو تشفی ہو اور کوئی بات غیر تشفی بخش نہ ہے از روئے علم الیقین قربِ حق سے دوری نہ ہو کیونکہ اس مضمون میں نور اور سر کا ذکر نہیں کیا جائے گا اسی مطلب کو مسعود بکؒ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے ؎

جسم بے جان کے بود اے مردِ کار روح بے حق کے بود اے ہوشیار
جسم از جان زندہ بین عین الیقین روح از حق زندہ داں تو شک میار
جسم از خاک است و باد و آب و نار صورت آدم بکردہ از چہار
اندریں صورت یکے معنی بداں بگذر از صورت بمعنی روی آر

مولانائے روم کا قول دل کے بیان میں اس طرح ہے ؎

دل بدست آور کہ حج اکبر است از ہزاراں کعبہ یک دل بہتر است
کعبہ بنگاہ خلیل آذر است دل گزرگاہ جلیل اکبر است
آئینہ ات دانی چرا غماز نیست زانکہ زنگار از رخش ممتاز نیست

آئینہ کز زنگ و آلایش جداست | پر شعاعِ نورِ خورشیدِ خداست

یہاں اب بذریعہ نفس دل، روح اور ذات کے عروج کے متعلق ذکر کیا جاتا ہے ؎

رو تو زنگار رُخِ او پاک کن | بعد ازاں آں نور را ادراک کن
سوختم ایں تے و خاکستر شدم | در نیستان رفتم و مضمر شدم
احمدا چوں دورۂ میم از تو رفت | ماند احد دیگر مشو تو گرم و تفت
دورۂ میم آں تعینہائے تست | لاکن ایں را تا شود آلاتِ چیست
وقت آں آمد کزیں قفسِ بریرم | رخت سوی ملکِ لاہوتی برم
ہم کزآنجا آمدم کانجا روم | با جمالِ یار بے پردہ شوم!

تحقیقِ نفس کے متعلق ایک نص قرآنی اور حدیث شریف بھی ہم ناظرین کے پیش کرتے ہیں :-

حدیث شریف :- مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ یعنی جس نے اپنے نفس کو پہچانا پس اس نے اپنے رب کو جانا۔

تصحیح حدیث شریف یہ ہے کہ :- مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ بِالْحَدُوثِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالْقِدَمِ

ترجمہ :- جس نے پہچانا اپنے نفس کو بہ حیثیت حادث ہونے کے پس اس نے تحقیق پہچانا اپنے رب کو بہ لحاظ قدیم ہونے کے۔

دیگر یہ کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ بِالْعُبُودِیَّتِ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ بِالْمَعْبُودِیَّتِ یعنے جس نے پہچانا اپنے نفس کو بہ لحاظ عبد ہونے کے پس اس نے پہچانا اپنے رب کو بلحاظ معبودیت۔

جب جسم موجود ہے تو اس کے پہچاننے کے لئے قلب کی ضرورت ہوئی جب قلب نے جان لیا کہ فی الواقع جسم موجود ہے تو اس کو دیکھنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ اسی قلب نے اس قدر صفائی حاصل کی کہ مرتبۂ روح کو پہنچکر دیکھ بھی لیا۔ یہ تو مراتب ثلاثہ ہیں۔ اسی طرح اور مراتب طے کر کے خاصانِ حق قربتِ اللہ جل شانہٗ حاصل کرتے ہیں۔ اب غور طلب امور یہ ہیں کہ جسم، روح، اور قلب علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں یا ایک۔ اس جملہ کے رموز و مراحل بغیر ہادی برحق اور استادِ روحانی کے معلوم کرنا ناممکن ہے۔ اسی لئے مولانائے روم نے فرمایا ہے ؎

قال را بگذار و صاحب حال شو　　　پیشِ مردِ کاملے پامال شو!

مہرِ پاکان درمیانِ جان نشاں　　　دل مدہ الا بمہرِ دلخوشاں

دست زن در ذیلِ صاحب دولتے　　　تا ز افضالش بیابی رفعتے

واضح ہو کہ شریعت، طریقت، حقیقت، و معرفت جدا جدا نہیں بلکہ ایک ہیں اور اس کو اس طرح قیاس کر سکتے ہیں کہ شریعت ایک تخم ہے طریقت شجر حقیقت گل ہے اور معرفت پھل۔

اس تمام بحث سے یہ مفہوم ہوتا ہے کہ وہ عبادت ہی کس کام کی جس میں وصال و قربِ حق نہ ہو۔ اس لئے حدیث شریف ہے اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن معراج خود دیدارِ حق ہے بطفیل حضور سردارِ دو عالم ولفضل ایزد متعال یہ قریب ہر مومن کو حاصل ہو سکتا ہے۔ جس نے اس طریقہ کی عبادت اختیار کی وہ دیدارِ حق سے دنیا ہی میں سرفراز ہوا۔ اگر کوئی یہاں اس دولت سے محروم رہا وہ آخرت میں کیا خاک بہرہ ور ہو سکتا ہے چنانچہ عَلَیْہِ الْقَضَاۃُ فرماتے ہیں ؎

ہر کہ اینجا نہ دید محروم است　　　در قیامت ز لذتِ دیدار

اور نص قرآنی بھی اسی بات کی دلیل پیش کرتی ہے مَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى
کسی عارف نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے ؎

ہے شریعت میں عبادت تن کے سا | ہے طریقت میں عبادت من کے ساتھ
در حقیقت ہے عبادت جان سے | معرفت میں دید ہے سجان سے

اور پھر فرماتے ہیں ؎

جامعیت گر نہیں کامل نہیں | تفرقہ میں معرفت حاصل نہیں

شریعت:۔ منزلِ ناسوت ہے اور اس میں تین مقام ہیں۔ توبہ۔ زہد۔ ذکر۔ شریعت میں توبہ وہ ہے کہ جوارح سے کوئی گناہ نہ کرے۔

طریقت:۔ اس میں گناہ سے دل کو صاف رکھنے کو توبہ کہتے ہیں۔ یہ منزلِ ملکوت ہے اور اس میں تین مقام ہیں۔ توکل۔ قناعت۔ خلوت۔

حقیقت:۔ یہاں اپنی ہستی سے گذر جانے کو توبہ کہتے ہیں۔ یہ منزلِ جبروت ہے۔ اس کے دو مقام ہیں۔ مراقبہ اور توجہ۔

مولانائے روم نے حقیقت کی نسبت یوں ارشاد فرمایا ہے ؎

گفت لیلیٰ را خلیفہ کان توئی | کز تو مجنوں شد پریشان و غوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی | گفت خامش چوں تو مجنوں نیستی
دیدۂ مجنوں اگر بودے ترا | ہر دو عالم بے خطر بودے ترا
با خودی تو لیک مجنوں بیخود است | در طریقِ عشق بیداری بد است

چونکہ مضمون طویل ہو رہا ہے لہذا نہد اور ذکر کا یہاں ذکر نہیں کیا جائے گا۔ ان مباحث و مسائل کی روشنی میں اگر سچ پوچھو تو ولی کو حافظ ہندوستان کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کیونکہ جو رنگ، ڈھنگ فصاحت، بلاغت، موزونیت عشق حقیقی اور توحید کی چمک جھلک دیوان حافظ میں پائی جاتی ہے وہی دیوان ولی میں بھی ہے۔ ولیؒ نے جس کلام میں ان تمام مراحل کو طے کیا ہے اس میں سے چند شعر درج ذیل کئے جاتے ہیں۔

شعر اوّل:۔ مدت کے بعد آج کیا جوں ادا سوں بات کھلنے سوں اُس لباں کے ہوئی حل مشکلات

مطلب یہ کہ:۔ مدت کے بعد تو نے جو آج بصد ناز و ادا گفتگو کی (یہ نفسی فعل ہے) یعنی عرصہ دراز سے جو لب بند تھے اُن کے آج کھلنے کی وجہ سے بہت ساری مشکلیں حل ہوگئیں۔ یہ اپنے مرشد کی طرف خطاب ہے فرماتے ہیں نفسی فعل سے قلب کی طرف رجوع ہوا اور تیری گفتگو کو جان لیا۔ اس نفسی بات کو جاننے کے بعد میرا گزر مقام روح کی طرف ہوا اور اس کے ذریعے سے سر اور نور کو بھی طے کیا جس کی وجہ سے وصال حق حاصل ہوگیا۔ حل مشکلات سے مقصد ان تمام مدارج کا طے کرنا ہے اور گفتگوئے پیر کلام حق سے کم نہ تھی اور پیر جلوہ گاہِ کبریا تھا جس کے باعث کلام کا اثر فوراً ایسا ہوا کہ سب مراحل طے پا گئے۔ اسی مضمون کو مرشد برحق حضرت کمال اللہ شاہ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے

آثار و فعل و وصف سے اپنی نظر نکال رکھ بر وجود ذات اگر مرد و اصلی

یا اس طرح سمجھیئے آثار و آیات جن کو نفس کہتے ہیں اور اُن کا فعل یعنی گفتگو جب اس پر نظر ڈالی جائے تو حرکت نظر آتی ہے اور اس حرکت سے فاعل حقیقی کا وصف نظر آتا ہے اور اس وصف سے آگے بڑھیں تو خود فاعل حقیقی نظر آتا ہے۔ لَا تَتَحَرَّكُ شَيْءٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ جب اللہ کا

حکم ہوتا ہے تو روح حرکت میں آتی ہے اور اس حرکت سے فعل صادر ہوتا ہے اور فعل کے سرزد ہونے کے لئے آل کی ضرورت ہے اور وہ نفس ہے جس سے فعل ادا ہوتا ہے یہ تنزل ہے اور تنزل سے اوپر ذات تک گزر کرنا عروج ہے۔ اب خیال فرمائیں کہ ولی کے کلام میں کیا راز ہے اور حضرت کمال اللہ شاہ نے بھی اس مسئلہ کو کس طرح حل فرمایا ہے قال ہی میں حال ہوا کرتا ہے یعنی وجدان کی کیفیت طرزِ بیان سے پیدا ہوتی ہے۔ قال کے دو اقسام ہیں قال صحیح اور قال غیر صحیح۔ قال صحیح میں حال ہے اور غیر صحیح میں جنجال اور الحاد۔ مولانائے روم کا ارشاد ہے

قال را بگذار و صاحب حال شو پیش صاحب کاملے پامال شو

فرماتے ہیں کہ قال غیر صحیح کو چھوڑ ورنہ ملحد ہو جائے گا بلکہ کسی کامل کے پاس جا اور اپنی خودی کو چھوڑ کر خموشی اختیار کر۔ اس کے کلامِ حق کو اعتقاد کے کانوں سے سن تاکہ صاحبِ حال ہو جائے اسی مضمون بالا کو مولوی معنوی نے بہ تفصیل تمام کس عمدگی سے ادا کیا ہے ملاحظہ ہو

صورت و دیوار و سقف ہر مکاں سایۂ اندیشۂ معماردان
گرچہ خود اندر مکان افتکار نیست سنگ و چوب و خشتے آشکار
فاعل مطلق یقیں بے صورت است صورت اندر دست او چوں آلت است

اور اشعار طوالت کے خیال سے درج نہیں کئے گئے اگر شوق دامنگیر ہو تو مثنوی مطبوعہ مطبع گلاب سنگھ کا صفحہ ۵، ۵ ملاحظہ کیجئے۔

بہر حال اسی طرح اگر ولی کے ہر ایک شعر کا مطلب بیان کیا جائے تو ایک دفتر کثیر جمع ہو جائے مگر ان امور کی تکمیل کے لئے وقت اور فرصت کی بے حد ضرورت ہے جو اس وقت مجھکو میسر نہیں۔

ولی کی اسی غزل کو دیکھیے جس کا ایک شعر ہم نے اوپر لکھ دیا ہے اس کے دوسرے اشعار بھی درج کرتے ہیں

دیکھے سوں مجھکوں آج شب و روز نیک ہے   وہ زلف و رُخ کہ جن سوں عبارت ہے دن و رات

زلف و رخ آثار و آیات ہیں جن کو دیکھنا فعل روح ہے فعل روح کے ساتھ فعل قلب بھی پورا ہوجاتا ہے۔ اس معائنے سے روے یار نظر آتا ہے بشرطیکہ علم الیقین ہو ؎

ہر ایک میٹھی بات ہے تیری نبات ریز   گویا رکھی ہے لب نے ترے مایۂ نبات

اس میں بھی وہی راز ہے جو شعر اول میں ہے ؎

ظلمات سوں نکل کے جہاں میں عیاں ہے   گر حکم لیوے لب سوں ترے چشمۂ حیات

ظلمات سے عدم مراد ہے۔ جہاں یعنی دنیا میں عیاں ہونا اعیان ثابتہ کا خارج میں آنا مقصود ہے یہ بغیر حکم خالق ناممکن ہے۔ حکم سے مراد کُن فیَکُون مفہوم ہوتا ہے ان تمام مراتب کو طے کر کے خارجہ میں آنا اور آثار کے لفظ سے خطاب پانا تنزل ہے اس میں آثار افعال و اوصاف موجود ہیں

تجھ ناز و ادا سوں میری ہے یہ غرض عرض   یا عین التفات ہو یا حکم التفات

ناز و ادا صفات معشوق ہیں۔ اگر تیری ناز و ادا کی مجھ پر التفات ہوجائے تو میری خودی باقی نہیں رہے گی اور میں فانی بخود اور باقی بحق رہوں گا' یا یہ کہ میری طرف ایسی توجہ ہوجائے کہ جس میں غیریت نہ رہے اور میں عین ہوجاؤں۔ اس شعر میں جملہ مراتب طے ہوجاتے ہیں ؎

تب سوں اٹھا ہے دل سوں میرے غیر کا خیال   تیرا خیال جب سوں ہوا ہے مرے نکات

خیال کو عالم ارواح سے تعلق ہے۔ یعنی جب سے میں نے تجھ کو دیکھا ہے غیریت باقی نہیں رہی بلکہ عین الیقین ہوگیا ہے اور تیری دید کے سوا اور کوئی شغل نہیں۔ سعدیؒ کا ایک شعر اسی

تصدیق کرتا ہے وہ فرماتے ہیں ؎

بدر دیقین بر دہائے خیال نماند سرا پردہ الاجلال

(۷) اُس وقت مجھ کو عیش دو عالم ملے ولی جس وقت بے حجاب کروں پیو سنگات بات

یہاں پیو سے مراد خدا ہے۔ اشتیاق دید و گفتگو کا اس میں اظہار کیا ہے۔ خدا سے اس طرح تکلم کی خواہش آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی بدولت دامنگیر ہوئی ورنہ موسیٰ علیہ السلام کو بھی یہ بات میسر نہیں ہوئی بلکہ کوہِ طور جل گیا اور آپ پر غشی طاری ہوی اور آپ گر پڑے۔

ذرا غور و تامل سے اگر کام لیں اور فضل و لطف ایزدی شامل حال ہو تو ان رموز کا انکشاف ہوجاتا ہے اسی لئے تو خالقِ حقیقی نے آدم کو لَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ کے خطاب سے سرفراز فرمایا ہے چونکہ یہ ذکر وصل و قرب کا ہے لہذا یہاں سب مراتب طے ہوجاتے ہیں۔ مولانائے روم نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے ؎

قرب نے بالا زپستی رفتن است قربِ حق از قید ہستی رستن است

نحن اقرب گفت من حبل الورید تیر فکرت را تو افگندی بعید

یہاں اور ایک غزل ہم اربابِ غور و فکر کے لئے پیش کرتے ہیں جس میں بظاہر عشقِ مجازی کی جھلکیں دکھائی دیتی ہیں مگر چشم باطن شناس کو سوائے حقیقت کے اور کچھ نظر نہیں آئے گا ملاحظہ ہو

مت غصے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا ٹک مہر کے پانی سوں یہ آگ بجھاتی جا۔

مطلب یہ کہ چونکہ تو مجھ سے جُدا ہوگیا ہے جس کی وجہ سے میں آتش فراق میں جل رہا ہوں اس پر طرہ یہ کہ تو بھی آتشِ غضب سے مجھ کو جلا رہا ہے تو کیا میں جل کر خاک نہیں ہوجاؤں گا؟

اس وقت تو ہی تو رہے گا اور تجھ کو خدا کون کہے گا؟ اور تیری جلوہ گری کیسے ہوگی؟ ولی نے دوسرے شعر میں فرمایا ہے کہ میں اگر جلتا ہوں تو تو بارانِ رحمت سے اس آتشِ غضب کو بجھا تاکہ میں بھی تیرا نام لیوا تیرے درشن کرنے کو باقی رہوں ایسی صورت میں بندہ اور خدا یا عبد و معبود باقی رہیں گے۔

(۲) تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف ۔ اے نازبھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا

مطلب:۔ میں تیری چال کی قیمت سے واقف نہیں ہوں کیونکہ تیرے خرام کے بے شمار طور و طریقے ہیں مگر تو مجھ کو ایسا بھاؤ یعنی ناز و عشوہ دکھا کہ جس سے میں یہ معلوم کرلوں کہ ہر چال میں بس تو ہی تو ہے اسی مضمون کو مولانا رومؒ نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے ؎

جملہ معشوق است و عاشق پردۂ ۔ زندہ معشوق است و عاشق مردۂ

ایک اور شاعر اس طرح کہتا ہے ؎

تیرے خرامِ ناز نے قبر میں دل ہلا دیا ۔ چین سے سو رہا تھا میں تو نے مجھے جگا دیا

(۳) اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں ۔ ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا

چونکہ تو اندھیری رات میں ہر جگہ گھوما کرتا ہے میں تجھ کو کس طرح پاؤں؛ اس کی بس ایک ہی تدبیر ہوسکتی ہے کہ تو اپنے پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سنایا کر تاکہ مجھ کو پتہ لگ جائے کہ تو کس کس جگہ موجود ہے ۔ کائنات ایک ظلمات ہے جہاں انسان طرح طرح سے راستہ بھٹک جاتا ہے اور راہ راست کا نشان ملنا آسان نہیں۔

یاد رہے کہ ذکرِ جلی کی ایک قسم ہے جس کو پاس انفاس کہتے ہیں اس میں ہمیشہ خدا ہی سے دل لگا رہتا ہے یہ کیفیت خود نفسِ ذات میں موجود ہے جس کو سیر النفس کہتے ہیں ۔ اندھیری سے مراد جسم ہے اور بچھوؤں سے مراد نفس یعنی سانس کی آواز ۔ اسی مضمون کو حافظ یوں فرماتے ہیں ؎

شبِ تاریک و بیمِ موج و گردابے چنیں حائل
کجا دانند حالِ ما سبکساران ساحل ہا

(۴) مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے
یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا

مطلب:- میرا دل جو مثل کبوتر کے ہے وہ تیرے لٹ کی جال میں پھنس گیا ہے یعنی دنیا کے نقش و نگار میں میری نظر جا پڑتی ہے اور دل ان اشکالِ ظاہری میں گرفتار ہو کر تیری دیدار سے محروم وہ جاتا ہے حالانکہ تیرا رخ (چہرہ) اسی نقش و نگار یعنی تیری زلف میں پوشیدہ ہے۔ یہ حجابات تیرے دیدار کے مانع ہو رہے ہیں۔ یہ کام دھرم کا ہے کہ کبوتر کو جال سے رہائی دے۔ ایسی صورت میں دل جو نقش و نگار اشکالِ مجاز پرستید ا ہے وہ روئے حقیقی کی طرف رجوع ہوگا اور ہمیشہ تیری ہی دیدار میں مشغول رہے گا۔

(۵) تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری
اے بت کے پجن ہاری اس بت کو پجاتی جا

تیرے مکھ کی یعنے ظاہری شکلِ مجازی کی پرستش میں میری ساری عمر گذر گئی لیکن میرا مدعا یہ ہے کہ تو بھی بندہ کا مشتاق ہو کر اس کو عدم سے وجود میں لا کر اس کا مشاہدہ کر رہا ہے اور اپنی حقیقت کو جو عالمِ اجمال میں تھی تفصیل وار دیکھ رہا ہے۔ ایسا ہی مجھ کو بھی اُس پرستش کی راہ بتا کہ ان بتوں کی شکلوں میں تجھ کو دیکھ کر تیری ہی پرستش کروں چنانچہ جامیؒ نے فرمایا ہے ؎

حسنِ خود را از روئے خوباں آشکارا کردۂ
پس بچشمِ عاشقاں او را تماشہ کردۂ

پرتوِ حسنت نگنجد در زمین و آسماں
در حریمِ سینہ حیرانم کہ چون جا کردۂ

جرعۂ از جامِ عشقِ خود بخاک افشاندۂ
ذوفنون عقل را مجنون و شیدا کردۂ

(۶) تجھ عشق میں جل جل کر سب تن کو کیا کاجل
یہ روشنی افزا ہے انکھوں میں لگاتی جا

تن کا عشق میں جل کر کاجل ہوجانا بیان کیا ہے۔ خیال کرنے کی بات ہے کہ انسان عشق مجازی ہی میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے نہ تو اس کو اپنے ننگ و نام کا خیال رہتا ہے اور نہ ہی عقل سے کام لینے کا شعور باقی رہتا ہے تو پھلا عشق حقیقی میں کیا کچھ کام نہ ہوتا ہوگا۔ وہاں غیریت جل جاتی اور مٹ جاتی ہے اور سوائے اللہ جل شانہٗ کے کچھ باقی نہیں رہتا اور اہل دنیا اس حالت کو دیوانگی سے تصور کرتے ہیں۔ بہرحال ولیؔ خدا کو مخاطب کرکے فرماتے ہیں کہ جب تن جل کر کاجل کی شکل اختیار کرے تو تو بھی اس کو اپنی آنکھوں میں لگا کہ سب نورٌ علیٰ نور ہوجائے اور تیرے کمالات لایزال کا جلوہ تو خود عالم اجسام میں دیکھا کرے جس سے تیرا مدعا بھی یہی ہے ورنہ تخلیق عالم کی کچھ پروانہ تھی۔ یہ شعر بھی مذکورۂ بالا شعر سے ملتا جلتا ہے مولانائے روم کا کلام عشق کے متعلق ملاحظہ فرمایئے۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما اے طبیبِ جملہ علتہائے ما!
اے دوائے نخوت و ناموسِ ما اے تو جالینوس و افلاطونِ ما
جسمِ خاک از عشق بر افلاک شد کوہ در رقص آمد و چالاک شد
عشق جانِ طور آمد عاشقا طور مست و خرّ موسیٰ صعقا

(۷) تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت یکبار ارے موہن چھاتی سوں لگاتی جا

تیرے عشق میں دل بے قابو ہوگیا اور میں نے فقیر و جوگی کی صورت اختیار کرلی ہے پس اے رے موہن (محبوب) ایک بار تو اپنے سینہ سے لگا تاکہ مجھ کو تشفی اور تسلی حاصل ہو۔

جب معانقہ کیا جاتا ہے جو اکثر اہل دل کا طریقہ ہے تو فوری شرح صدر ہوجاتا ہے۔ (بھی یہی فرماتے ہیں کہ تو میرے دل کو بعد معانقہ کشادہ کردے جس سے کہ تو ہی تو نظر آئے حضور سرورِ عالم کا

ارشاد ہے کہ مومنین آپس میں مصافحہ اور معانقہ کیا کریں تاکہ جانبین کو فیضانِ روحی حاصل ہو مگر اب یہ فعل برائے نام رہ گیا ہے بلکہ بعض لوگوں کے نزدیک باعث تمسخر خیال کیا جاتا ہے۔

(۸) تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دائم مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

مطلب:۔ تجھ گھر کی طرف اے معشوق ہمیشہ ولی آیا کرتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ہمیشہ ولی قلب کی سیر کیا کرتا ہے کیونکہ قلب کو بیت اللہ کہا کرتے ہیں پس اسی طرح اے محبوب حقیقی تو مجھ کو بھی ہمیشہ اپنی دیدار سے سرفراز کر۔

اب ہم کچھ 'توکل' اور 'قناعت' پر بھی لکھنا چاہتے ہیں تاکہ کلام ولی آسانی سے سمجھ میں آئے

توکل کی تعریف عارف حق مولا حیات خلیفہ حضرت کمال اللہ نے اس طرح کی ہے ؎

(عالمِ ملکوت) اس میں اول ہے توکل کا مقام کاملوں کو تفرقہ سے کیا ہے کام

ہے شریعت میں توکل مت بسر کام کرنا ہے خدا پر کر نظر

ہے طریقت میں توکل اس کا نام رب کے کر دینا حوالے اپنا کام!

سن حقیقت میں توکل ہے وہ چیز مت نظر رکھ غیر پر اے باتمیز

مولانائے روم نے اس طرح ارشاد کیا ہے ؎

(شرعی توکل) گفت پیغمبر بآواز بلند با توکل زانوئے اشتر ببند

رمز الکاسب حبیب اللہ شنو از توکل در سبب کاہل مشو!

توکل طریقت، شرعی توکل پر عمل کرنے کا نام ہے۔

گر توکل می کنی در کار کن ! کسب کن پس تکیہ بر جبار کن

توکلِ حقیقی سے

جان وگوش وچشم وہوش وپا ودست　　جملہ از دریائے احسانت پرست
شکر ایں شکر از کجا آرم بجا!　　من کیم از تست توفیق اے خدا
طاعت و توفیق طاعت ہم زتو　　لطفِ تو بر ما تو شستہ صد نکو

بہرحال توکل سے خود کو فنا فی الذات اور بقا بالحق کرنا مراد ہے مولانا فرماتے ہیں سے

چون فناش از فقرِ پیرایہ شود　　او محمد وار بے سایہ شود
شمع شد جملہ زبانہ پا و سر　　سایہ را نبود بگرد او گذر!
موم از خویش وز سایہ درگریخت　　در شعاع از بہر آنکہ شمع ریخت
گفت از بہر فنایت ریختم　　گفت من ہم در فنا بگریختم
شمع چوں در نار کلی شد فنا!　　نے اثر بینی ز شمع و نے ضیا

بہرحال جب تک یہ باتیں کسی طالبِ حق میں نہ پائی جائیں وہ توکل حقیقی کا حامل نہیں مانا جاسکتا یہ سب خدا کی دین ہے۔ روزِ ازل سے جس نے حصہ پایا وہی اس میں کامیاب ہوگا سے

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند　　میل او را در دلش انداختند

ایک اہم اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ طالبِ حق اِن امور کا خیال رکھے کہ تصوف علم توحید کو کہتے ہیں اور توحید وہی ہے جو احکام الٰہی اور احادیث کے مطابق ہو نہ کہ خلاف شریعت الحاد۔ تعطیل وتشریک افراط تفریط اور حلول سے مبّرا ہو۔ بندہ بندہ رہے اور حق حق اور پھر حق اور بندہ میں یگانگت ہو ورنہ زندقہ والحاد پر مبنی ہوگا۔ کسی عارف کامل نے فرمایا ہے سے

شخص وسے عکس ہیں ! یعنی جہاں بیچ رب
عکس وسے شخص ہیں رب میں جہاں اے عجب
صوفیہ کا یاد رکھو قاعدہ کلیہ خلق نہ ہو جائے حق عبد نہ ہو جائے رب
عطر کو کہنا شراب آب کو کہنا سراب خوب کو کہنا خراب کذب ہے اے بے ادب

واضح ہو تعلیم انبیا بھی یہی ہے سوائے اس کے اور تعلیم کذب و بے ادبی پر محمول کی جاتی ہے۔

قناعت۔ اس کے متعلق کسی بزرگ کا ارشاد ہے ؎

ہے شریعت میں قناعت اس کا نام ہے قناعت جامعیت کا مقام
جو ہو لابد اس پہ ہو وہ شاد حال اور نہ ہو حرص و ہوا کا کچھ خیال
اور طریقت میں قناعت اس کو گن رب سے اپنے جو رہے خوش رات دن
ہے حقیقت میں قناعت با ادب رہے کرتا رات دن رب کی طلب
تو ہی بس ہے مجھ کو میرے کارساز کام غیروں سے مجھے نہیں بے نیاز

مولانائے روم نے اس طرح ارشاد فرمایا ہے ؎

بر سماع راست ہر کس چیز نیست طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست
بند بگسل باش آزاد اے پسر چند باشی بند سیم و بند زر
گر بریزی بحر را در کوزۂ ! چند گنجد قسمت یک روزۂ
کوزۂ چشم حریصان پر نشد تا صدف قانع نشد پر در نشد

ہر کرا جامہ ز عشقے چاک شد او ز حرص و عیب کلی پاک شد

غور فرمائیں کہ فنا اور بقا بھی مقامِ توکل اور قناعت میں موجود ہے۔

آخر میں ولی کے کلام سے چند اور شعر ایسے نقل کئے جاتے ہیں جو تصوف کے رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر کلامِ ولی کا بنظرِ غور مطالعہ کیا جائے تو اس طرح کے سینکڑوں شعر پیش کئے جاسکتے ہیں۔[۹]

دیکھا ہے ایک نگہ میں حقیقت کے ملک کوں جب بےخودی کی راہ میں دل نے سفر کیا

خودی سے اولاً خالی ہو اے دل اگر اس شمع روشن کی لگن ہے

کہہ دی ہے اہلِ دل نے یہ بات مجھ کو دل سے عارف کا دل بغل میں قرآن حمائلی ہے

نشانی حق کے پانے کی حکمت کی بےنیازی ہے کشاکش کامِ اپنے کی حکمت کی کارسازی ہے

نکال خاطرِ فاتر سوں جامِ جم کا خیال صفا کر آئینۂ دل کا سکندری یو ہے

از بس کہ زندگی میں یوں محو ہوں ولی میں مشکل ہوا اجل کوں لینا سراغ میرا

ترکِ لباس جب سے کیا ہوں جہان میں جز خاکِ کوئے یار ہماری قبا نہیں

ترکِ لذت کی جس کوں ہے لذت شکر اس کوں ہے زہر زہر شکر

اے ولی عشقِ نکاہری کا سبب جلوۂ شاہدِ مجازی ہے

تواضع خاکساری سے ہماری سرفرازی ہے حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشقِ مجازی ہے

عارفاں پر ہمیشہ روشن ہے کہ فنِ عاشقی عجب فن ہے

جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ! وہ زمانہ کا فخرِ رازی ہے

پاکبازوں سے یہ ہوا معلوم عشق مضمونِ پاکبازی ہے

ولی کی معلومات
اور
خصوصیاتِ شاعری

از

نعیم النسا بیگم
بی۔ اے

ولی کی معلومات اور خصوصیات شاعری

ولی اردو شاعری کے وہ مشہور اور قابل قدر علمبردار تھے جن کی قادر الکلامی کا لوہا دورِ جدید کے شعرا و مصنفین بھی مانتے ہیں ایک ایسے نامور شخص کا جس نے شاعری کے میدان میں اپنا کمال دکھا کر اہل ہند کے دلوں کو مسخر کر لیا تھا یقین کے ساتھ نہ تو مولد معلوم ہے اور نہ سنہ ولادت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ سنہ ۱۰۷۹ھ مطابق سنہ ۱۶۶۸ء میں اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۰۵۵ھ مطابق سنہ ۱۷۲۲ء میں وفات پائی بعض مصنفین مثلاً گارساں۔ دی۔ تاسی۔ بلوم ہارٹ اور میرحسن کا خیال ہے کہ ان کی ولادت احمد آباد میں ہوئی بعض کو ان کی تاریخ پیدائش میں بھی اختلاف ہے۔ بہرحال ان کی تاریخ ولادت اور حالات زندگی کا اہم حصہ اب تک تاریکی میں ہے۔ اور کوئی بھی حقیقت حال کے چہرے کی نقاب کشائی نہ کر سکا۔ البتہ اس بات پر سب متفق ہیں کہ ان کی عمر کا حصہ زیادہ تر بلکہ تقریباً تمام احمد آباد ہی میں گذرا۔

ولی کو گجرات سے محبت ہی نہیں بلکہ عشق تھا۔ اور اُن کے جذب صادق کا اثر ان کو دوبارہ گجرات کھینچ لے گیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی دائمی خواب گاہ کے لئے اسی زمین کو پسند کیا اور وہیں دریا خاں کے گنبد کے سامنے دفن کئے گئے۔

ایسے بلند پایہ شاعر کے خاندان اور حالات زندگی کی تفصیل کا تو کیا ذکر اجمالی معلومات بھی حاصل نہ ہو سکے اس وقت تک ولی کے تعلیمی حالات پر بھی کافی روشنی نہیں ڈالی جا سکی۔ اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کو تحصیل علم اور سیر کتب کا شوق تھا جس کی خاطر وہ گجرات گئے۔ اور احمد آباد میں حضرت شاہ وجیہ الدین رحمتہ اللہ علیہ کی خانقاہ کے مدرسہ میں انہوں نے تعلیم پائی۔ وہیں حضرت شاہ نور الدین صدیقی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور ان کی یادگار میں ایک رسالہ بعنوان نور المعرفت لکھا۔ احمد آباد کے دوران قیام ہی میں ایک صاحب باطن سید ابوالمعالی سے بھی ان کی نہایت دوستی ہو گئی تھی۔

ولی نے دہلی کا بھی سفر کیا۔ جہاں حضرت شاہ سعد اللہ گلشن سے جو ایک عالم بزرگ اور شاعر تھے ملاقات ہوئی۔ غرض کچھ تو بزرگوں کی صحبت اور کچھ سیر و سیاحت نے اُن میں پختہ مغزی پیدا کر دی تھی اُن کی ذاتی قابلیت اور استعداد کا صحیح اندازہ اُن کے کلام کے مطالعہ ہی سے مل سکتا ہے جس کی طرف ہم نے اس مضمون میں خاص توجہ کی ہے۔

ہندوستان کے مشہور شعراء میں ولی کی ایک ممتاز اور واجب التعظیم ہستی تھی خود ان کے ہمعصر بھی انہیں اعلیٰ درجہ کا شاعر تسلیم کرتے تھے۔ خاصکر اردو ادبیات کی تاریخ میں تو ولی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اہل ہند ولی کے اردو شاعری کے اولین استاد ہونے کا بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ولی اردو زبان کے ایک بہت بڑے محسن اور جدید اردو شاعری کے باوا آدم تھے۔ وہ "بابائے ریختہ" کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں اردو دنیا میں اُن کی خاص تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ تقریباً سو سال قبل ایک شاعر بیرخان کمترین نے لکھا تھا۔ مصرعہ

ولی پر جو سخن لا دے اُسے شیطان کہتے ہیں

اپنے کلام کی نسبت خود ولی کا یہ خیال تھا ؎

پڑھتے ہیں ولی شعر ترے عرش پہ قدسی — باہر ہے تری فکرِ رسا حدِ بشر سوں
یوں تو ہے انتخابِ عالم میں — جیوں کہ ہے آدمی میں نطقِ سخن
ولی جس نے سنا تیرے سخن کو — زباں پر اُس کے ذکرِ آفریں ہے
ہوا جو خادمِ شاہِ ولایت — ولی ہے والیٔ ملکِ سخن ہے
کہتے ہیں شاعرانِ زمن تجھ کو لے ولی — ہرگز ترے کلام میں ہم کو نہیں ہے شک
ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص — ہر اک مصرعہ تیرا موتی کی لڑ ہے

ولی کے کلام کا مطالعہ کرنے سے اور ادبِ اردو کے مورخین کی محققانہ کاوشوں اور انتھک کوششوں کی بدولت آج ہمیں ان کی زبان اور شاعری کے متعلق بہت کچھ دلچسپ معلومات حاصل ہیں ولی نے مختلف اصنافِ سخن مثلاً غزل، قصیدہ۔ رباعی، قطعات۔ ترجیع بند اور مستزاد وغیرہ میں طبع آزمائی کی ہے ان کے علاوہ مخمس اور مثنوی میں بھی نئی زمین نکالی ہے۔ اور ہر صنف میں اپنا زورِ کلام اور زورِ تخیل دکھایا ہے۔ مگر نسبتاً ان کے کلام میں قصائد بہت کم ہیں۔ جس کی وجہ شاید یہ تھی کہ انہیں تعریف، خوشامد، نام و نمود، اور شان و شوکت سے نفرت تھی۔ ان کی طبیعت صبر و شکر اور تسلیم و رضا کی طرف مائل تھی۔ ان کا شیوہ گوشہ نشینی تھا۔ ان کی خودداری نے انہیں کوئی قصیدہ کسی بادشاہ یا امیر کی مدح یا خوشامد میں لکھنے کی اجازت نہیں دی۔ ان کا سب سے بہتر قصیدہ وہ ہے جو حضرت شاہ وجیہ الدین نور اللہ مرقدہٗ کی مدح میں لکھا گیا ہے۔ علاوہ بریں اس امر کو نظر انداز نہ کرنا چاہئیے کہ ولی اورنگ آبادی عہدِ اورنگ زیب کے شاعر تھے۔

کلیات ولی میں ہر رنگ کی سخن آفرینی پائی جاتی ہے جس سے ہمیں ان کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے وہ ایک مستند شاعر تھے۔ اور زمانہ موجودہ میں بھی ان کا کلام وقعت کی نگاہوں سے دیکھا اور دلچسپی سے پڑھا جاتا ہے دنیا تین سو سال کی مسافت طے کر چکی ہے مگر ولی کا سلیس اور عام فہم کلام آج کل بھی اہل ذوق میں مقبول ہے۔ وہ ایک فطرتی شاعر تھے۔ ان کے کلام میں جوش صداقت، اور صفائی وسادگی پائی جاتی ہے۔ انہیں اردو شاعری میں وہی رتبہ حاصل ہے جو انگریزی میں چاسر۔ فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل تھا۔ ان کے زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے ان کے کلام میں اس قدر سادگی سلاست اور روانی ہے کہ بعض اشعار میں زمانہ جدید کی جھلک نظر آتی ہے۔ نظم کا نثر معلوم ہونا ایک کمال شاعری ہے جو ولی کے کلام میں ہر جگہ نمایاں ہے ؎

یک نگہ میں غلام کرتے ہیں — خوب رو خوب کام کرتے ہیں
دیکھ خوباں کو وقت ملنے کے — کس ادا سوں سلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں ولے — کام اپنا تمام کرتے ہیں
کیا وفادار ہیں کہ ملنے میں — دل سوں سب رام رام کرتے ہیں

حسن دلبر کا خواب میں دیکھا — نور حق تھا حجاب میں دیکھا
خود ونما ہو کے ذات میں ملنا — یہ تماشا حباب میں دیکھا

اے بے خبر اگر ہے بزرگی کی آرزو — دنیا کی رہگزر میں بزرگوں کی چال چل

گر سخن فہم تجھ کو پاؤں گا — حال دل کا تجھے سناؤں گا
اور مجھ پاس کیا ہے دینے کو — دیکھ کر تجھ کو رو دیتا ہوں

یہ ریختہ ولی کا جاکر اُسے سناوو   رکھتا ہے فکر روشن جو انوری کے مانند

ترے مکھ پہ لے نازنیں یہ نقاب   جھلکتا ہے جیوں مطلع آفتاب

ولی ایک پُرگو شاعر تھے۔ ایسے صاحبِ کمال دنیا میں کم پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی سیرت، پاک دامنی، اور صاف دلی ظاہر ہے۔ وہ ایک صوفی منش انسان تھے۔ ان کے بعض اشعار صبر و قناعت اور بے نیازی کا مرقع ہیں مثلاً ؎

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر   مشتاق نہیں سکندری کا

پھیکی لگے اسکوں شانِ دولت   چاکھیا ہو مزا قلندری کا

پایا ہوں ولی سلطنتِ ملکِ قناعت   اب تخت و چھپر حق میں مرے ارض و سما ہے

اس بلند پرواز شاعر کو جذباتِ فطرت اور مناظرِ قدرت کی تصویر کھینچنے کا خوب ملکہ تھا۔

ولی نے شہروں، ستاروں، کوہساروں، چشموں، اور سمندروں وغیرہ کے مناظر نہایت خوبی سے پیش کئے ہیں۔ ان کے کلام سے ان کی وسیع سیر و سیاحت کا جگہ جگہ پتہ چلتا ہے۔ ان کی مثنوی جو شہر سورت کی تعریف میں لکھی گئی ہے بہت مشہور ہے۔ اس کے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں ؎

عجب شہر ان میں ہے پُرنور اک شہر   بلاشک وہ ہے جگ میں مقصدِ دہر

جگت کی آنکھ کا گویا ہے وہ نور   اچھو اُس نور سوں ہر چشم بد دور

شہر ایک منتخب دیوان ہے سب   ملاحت کی وہ گویا کان ہے سب

شہر سوں ہے وہ ہم پا زوہمیشہ   دریا سوں ہے وہ ہم پہلو ہمیشہ

وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم   صبح اور شام جب کرتا ہے عالم

عجب قلعہ ہے وہاں اک با قرینہ — انگوٹھی میں دنیا کے جیوں نگینہ
نزک قلعہ کے بار اگھاٹ ہے وہاں — کہ دائم گلرخاں کا ہاٹ ہے وہاں

ولی کے کلام میں اکثر جگہ عشق و حسن کا بھی تذکرہ آیا ہے۔ اور جہاں جہاں انہوں نے معشوق کا ذکر کیا ہے۔ یا اس کا سراپا کھینچا ہے تو ان کے ہر لفظ سے محبت آمیز پرستش ظاہر ہوتی ہے۔ ولی کا محبوب مبالغہ کی دنیا کا بادشاہ ہے اور اس کا ذکر ایک خاص انداز و اہتمام کے ساتھ کیا گیا ہے۔ جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعر ایک ایسے لاگ حسن پرست اور حسن کار ہے۔ ولی کے تخیل میں کسی خاص حبیب کا نقشہ تھا جس کا سراپا ایک عجیب دلکش انداز میں نمایاں ہے۔ کلیات میں اس قسم کے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں مثلاً ؎

کتاب حسن کا یو مکھ صفا تیرا صفا دستا — ترے ابرو کے دو مصرعے سوں اس کا ابتدا دستا
نیرا مکھ حسن کا دریا و موجاں چین پیشانی — اپر ابرو کے کشتی کے پوتل جیوں ناخدا دستا
ترے لب ہیں بظاہر حوض کوثر مخزن خوبی — یہ خال عنبریں تس پر بلال آسا کھڑا دستا
ترے یاقوت لب کی دیکھ لالی — ہوئی روشن دلاں کی فکر عالی
ترے پاؤں کی خوبی پہ نظر کر — ہوئے ہیں گلرخاں جیوں نقش قالی
تری انکھیاں دسیں ہیں یوں سیتے — پیا گویا شراب پرتگالی
تری انکھیاں میں ڈورے دیکھ کر سرخ — بنائی عشق نے ریشم کی جالی
ولی جب سوں ہوا ہم کار فرہاد — سنا جب سوں تری شیریں مقالی

فخر اور شاعرانہ تعلّی شاعروں کی میراث سمجھی جاتی ہے پھر ولی اس سے کیسے مستثنیٰ ہوسکتے تھے؟

اس فصاحت آگے ولی مجھ کوں — نطقِ سحبان عبارت مہمل

اے ولی یہ قصیدۂ رنگین — جگ میں رکھتا نہیں نظیر و بدل

شہرت ہوئی ہے جب سوں ترے شعر کی ولی — مشتاق تجھ سخن کا عرب تا عجم ہوا

اے ولی لگتا ہے ہر دل کو عزیز — شعر تیرا بسکہ شوق انگیز ہے

گوش حاسد میں جب پڑے یہ شعر — راکھ ہو جائے رشک سوں جل جل

ولی اپنے دکنی ہونے پر فخر کرتے ہیں ؎

ولی ایران و توران میں ہے مشہور — اگرچہ شاعرِ ملکِ دکن ہے!

ہوا جو خادم شاہِ ولایت — ولی ہے والیٔ ملکِ سخن ہے

کسی کے اعلیٰ شاعر ہونے کا ایک معیار یہ بھی ہے کہ اس کا کلام مقبولِ عام ہو اور ولی کو یہ شرف بدرجۂ اتم حاصل ہے ان کے کلام کے نسخوں کی رسائی نہ صرف کل ہندوستان بلکہ یورپ تک ہوئی ہے جس سے یہ اظہر من الشمس ہے کہ ان کا کلام دوسری قوموں کے دلدادگان ادب میں بھی مقبولیت حاصل کر چکا ہے۔ ولی کے اعلیٰ شاعر ہونے کا بدیہی ثبوت گجرات اور دکن میں "یومِ ولی" منا کر ولی کے کمال سخن آفرینی کا اعتراف کرنے کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی انسان اس دارِ فانی سے کوچ کر جاتا ہے تو اس کا خیال خواہ وہ کیسا ہی قابل اور مقدس ہو روز بروز دلوں سے نکلتا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں ولی کی وفات کے صدیوں بعد "یوم ولی" منا کر ان کی یاد کو تازہ کرنا اور ان کی شہرت کو بقائے دوام عطا کرنا کوئی معمولی بات نہیں ہے ؎

یوں تو منہ دیکھے کی رہتی ہے محبت سب کی — جب میں جانوں کہ مرے بعد مرا نام رہے

ولی ہی نے ریختہ کو سرزمین شمال میں رواج دیا۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایسا بے بہا سرمایہ چھوڑ گئے جس پر اہل دکن کو فخر و ناز ہے۔ ولی ایک کامل شاعر اور باکمال انسان تھے ۔ و کے قدیم و جدید شعرا میں کوئی ایسا نہیں پایا جاتا جو ولی کی طرح صد فی صد ہندی کہلانے کا حق ہو۔ سب سے پہلا دیوان ہندی زبان میں لکھا ہوا انھیں کا شائع ہوا ہے۔ ولی نے اردو میں ری کی ایسی مستحکم بنیاد ڈالی کہ آج تک اس میں ذرا سی بھی جنبش نہیں ہوئی۔ قدیم شعرا کے کلام میں یادہ تر فارسیت کا اثر غالب تھا مگر ولی نے بھاشا کی تقلید کو فارسی کی تقلید پر ترجیح دی۔ اِن کے م میں جا بجا ہندی اور دکنی الفاظ ایسے جڑ دئے گئے ہیں جیسے انگوٹھی پر نگینے۔ سچ تو یہ ہے کہ ی نے ریختہ کی ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالی ملاحظہ ہو ؎

چاہو کہ ہو ولی کے نمن جگ میں دو رہیں — انکھیاں میں سرمہ پیو کی خاک چرن کرو
تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف — اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کو پکڑا ہے تری لٹ نے — یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کو چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی بجن ہاری اس بت کو بچاتی جا

تجھ گھر کی طرف سندر جاتا ہے ولی دائم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

براگی جو کہاتے ہیں اُسے گھر بار کرنا کیا — ہوئی جوگن جو کئی پی کی اسے سنسار کرنا کیا

جو ہووے برت کا پانی اسے کیا کام پانی سوں　　جو بھوجن دکھ کا کرتا ہے اُسے آدھار کرنا کیا

علاوہ بریں ولی نے اردو بزم ادب کی آرائش کے لئے نرے دیسی مضامین منتخب کئے ہندوستانی حکایتوں اور ہندوستانی تمثیلوں سے بھی ان کا کلام مالامال ہے جس میں جا بجا ہندی اثر ہندی الفاظ اور محاورات پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ؎

ترے غم سے تپتی ہے چھاتی مری　　ہوئے اشک سے دو نین نربدا
کفر کو توڑ دل سوں دل میں رکھ گر نیت خالص　　ہوا ہے رام بن حسرت سوں جا لچھمن سوں جا لم اس کا
ترا قد دیکھ کر کہتی ہے قمری　　کہ ہرگز سرو میں ایسی ادا نئیں

کوچۂ یار عین کاسی ہے　　جوگئی دل وہاں کا باسی ہے
پی کے بیراگ کی اداسی سوں　　دل بھی بیراگی و اداسی ہے
اے صنم تجھ جبیں اوپر یہ خال　　ہندوے ہر دوار باسی ہے
زلف تیری ہے موج جمنا کی　　پاس تل اس کے جیوں سناسی ہے
گھر ترا ہے یہ رشک دیول چین　　اس میں مدت سے دل اداسی ہے
یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر　　ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

ان اشعار سے ظاہر ہے کہ ولی ہندی محاورات اور ہندی الفاظ کے استعمال میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ فارسی تراکیب اور ہندی الفاظ کے برمحل استعمال سے ولی کا کلام ان کے ہمعصروں پر فوقیت رکھتا ہے۔ ولی کی بدولت ہندی شاعری نظم فارسی کے ہم پہلو ہو گئی اور ایک قدم پیچھے نہیں رہی۔ انھوں نے ہندی اور فارسی کی آمیزش سے اردو شاعری کی ترقی کے لئے ایک جدید را

قائم کی۔ اور ہندی و فارسی کے الفاظ کو شیر و شکر کردیا۔ ان کے بعد کے شعرا اور اُن کے شاگرد مثلاً سراج، اشرف وغیرہ نے ان کی تقلید کرنے کی کوشش کی۔ اور ایک حد تک کامیاب بھی رہے ولی کے بعض بعض اشعار میں فارسیت کا اثر بھی صاف نمایاں ہے مثلاً ؎

غضب سوں چہرۂ رنگیں بہار ناز و ادا　　بہار حسن میں ہے لالہ زار ناز و ادا
چمن طراز نزاکت کیا ہے صنعت سوں　　سہی قدان کا مکاں جوئبار ناز و ادا
ولی پڑیا ہے نظر جب سوں وہ کمان ابرو　　ہزار دل سوں ہوا ہوں شکار ناز و ادا
نہ تنہا حسن خوباں دلربا ہے　　ادا فہمی سخن دانی بلا ہے
سخن داں آشنا فضل خدا ہے　　صنم میرا سخن سوں آشنا ہے

کلیات ولی کے مطالعہ سے ہم اس زمانے کی اور آج کل کی اردو زبان کا فرق بخوبی معلوم کرسکتے ہیں۔ ان کا کلام اُس زمانے کے شرفا کے کلام کی تصویر پیش کرتا ہے۔ شاعرانہ جذبات جذبہ پروازی ترنم اور موسیقیت ان کے کلام میں وجدانی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ کلام سے سادگی وافی اور بے ساختگی ظاہر ہوتی ہے۔ تصنع اور بناوٹ کا شائبہ بھی نہیں۔ مبتذل خیالات اور امیانہ جذبات سے ان کی شاعری کا دامن پاک ہے۔ کہیں کہیں شوخی اور عریانی بھی ہے تو برائے نام ؎

جب سے وہ نازنین کی میں دیکھا ہوں چھب عجب　　دل میں مرے خیال ہے تب سوں عجب عجب
بیتاب ہو کے مثل گدایاں نزیک جا　　بیباک ہو کے تب یوں کیا میں طلب عجب
دو نین سوں تیرے ہے دو بادام کا سوال　　سن یوں سوال دل میں رہا بستہ لب عجب

یکتا ہیں اس سوال ہیں دو جا بھی اک سوال | کر بہرہ مند لب سوں کہ تیرے ہیں لب عجب
یکبار اس سوال ہیں سُن یو دو جا سوال | دل میں رہا ایس کے وہ شیریں لقب عجب
اوّل تو شوخ آ کے غضب ہیں غصہ کیا | سرتا قدم جو ناز اٹھا وہ غضب عجب
آخر ایس کے ہمت عالی پہ کر نظر | شیریں لباں سوں اپنے چکھایا رطب عجب

ولی نے ہر صنفِ سخن میں اور مختلف زمینوں اور بحروں میں طبع آزمائی کی ہے لیکن اس کے کلام میں غزلیات کا ذخیرہ زیادہ پایا جاتا ہے وہ غزل کے بادشاہ تھے۔ ان کا شگفتہ تغزل اور پُر کیف اسلوب دلوں کو لبھاتا ہے۔ ان کی غزلیات میں لطف شاعری کے ساتھ ایک خاص کیف اور درد بھی پایا جاتا ہے۔ اور ان ہی کے مطالعہ سے ان کی صوفیانہ زندگی پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ان کی شاعری ان کے جذبات کا آئینہ اور ان کے دل کی آواز ہے ان کے کلام میں آمد ہے نہ کہ آورد۔ وہ فطرت کے ترجمان تھے۔ یقیناً ان کا درجہ اردو شاعری میں نہایت بلند ہے۔

ولی کا کلام عہدِ اورنگ زیب کا کلام ہے جب کہ زبان خود ایک انقلابی دور سے گزر رہی تھی۔ اہل شمال اور اہل دکن کے میل جول سے نئی نئی ترکیبیں اور نئے نئے الفاظ زبان میں داخل ہو رہے تھے۔ قدیم الفاظ ترک کئے جا رہے تھے اور اردو شاعری ایک نیا رنگ اختیار کر رہی تھی۔ زبانِ اردو ولی کے اس عبوری زبان کو محفوظ کر دینے کی وجہ سے ان کی احسانمند ہے

ولی کے یہاں عشق مجازی سے متعلقہ اشعار کے ساتھ ساتھ حقیقت و معرفت میں ڈوبے ہوئے اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔ ان کا صبر و استغنا بے مثل ہے۔ ان کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان حتی الامکان اپنی ضروریات زندگی کو محدود یا وسیع کر سکتا ہے جس کو

دولتِ فقر حاصل ہوگئی ہے وہ اس زندگی میں مطمئن رہنے کے راز سے واقف ہوگیا۔ ان کا خیال ہے کہ انسان دنیا کے آرام و آسائش سے بے نیاز ہو کر استغنا کے درجہ پر پہنچتا ہے جب اس کو شان و شوکت سے کچھ سروکار نہیں ہوتا تو اس کو اپنا کاشانہ ہی ایک کشور سے زیادہ کشادہ معلوم ہوتا ہے ذیل کے اشعار سے ولی کی بے نیازی ظاہر ہوتی ہے ؎

پایا ہے جو کوئی دولتِ فقر مشتاق نہیں سکندری کا
پھیکی لگے اس کو شانِ دولت چاکھیا جو مزا قلندری کا

اسباب جہاں سے ہوں بیزار اس قدر بن تیل اور بتی روشن چراغ میرا
نہ پاوے دین کی لذت جسے دنیا کی ہے خواہش قفل ہے لذت دنیا حقیقت کے خزانے کا

تصوف کی طرف مائل ہوتے ہیں تو صوفیار کے انداز میں بڑے بڑے مسائل کہہ جاتے ہیں

رکھ دھیان کو ہر آن تو معبود طرف رکھ سیس کو ہر حال میں مسجود طرف
معدوم کو مسجود سوں کیا نسبت ہے اولی ہے کہ مائل ہوتوں موجود طرف

نعت میں بھی ولی تصوف ہی کی باتیں بیان کرتے ہیں ؎

عشق میں لازم ہے اوّل ذات کو فانی کرے ہو فنا فی اللہ دائم یاد یزدانی کرے
مرتبہ خلّت پناہی کا وہ پاوے گا جو کوئی مثل اسمٰعیل اوّل جیو کی قربانی کرے

بعض اشعار ایسے ہیں جن پر سرسری نظر ڈالنے والوں کو عشق مجازی کا رنگ نظر آئے گا لیکن ان کے اندر عشق حقیقی کا راز مضمر ہے کہتے ہیں ؎

جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ وہ زمانے کا فخر رازی ہے

اے ولی عشق ظاہری کا سبب　　جلوۂ شاہد مجازی ہے

مشق کر اے دل سدا تجرید کی　　عاشقی ہے ابتدا توحید کی

تواضع خاکساری ہے ہماری سرفرازی ہے　　حقیقت کے لغت کا ترجمہ عشق مجازی ہے

دل جام حقیقت ستی جو مست ہوا　　ہر مست مجازی سوں زبردست ہوا

یہ باغ دسا نظر میں تنکے سوں کم　　اور عرش عظیم پگ تلے پست ہوا

سچ تو یہ ہے کہ ولی کے کلام پر تصوف کا گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے مگر اس پر عشق مجازی کا پردہ ایسا پڑا ہوا ہے کہ سطحی نظر میں اس کو سمجھ لینا مشکل ہے۔

کلیات ولی کے مطالعہ سے پتہ لگتا ہے کہ ولی کے کلام میں تخیل کا ایک سمندر موجزن ہے اس بحر زخار میں اسی شخص کو عبور حاصل ہو سکتا ہے جو نظر عمیق اور فکر رسا رکھتا ہو۔ کہتے ہیں ؎

سجن کے غم سوں نکلتا ہے نالۂ بیتاب　　ہر ایک رگ ستی تار رباب کے مانند

ترے فراق میں ہر آہ اے کماں ابرو　　گئی ہے چرخ پہ تیر شہاب کے مانند

جب لٹک چال سجن کی مجھے یاد آتی ہے　　دل مرا رقص میں آتا ہے مثال رقاص

ترے غم سے تپتی ہے چھاتی مری　　ہوئے اشک سے دو نین نربدا

شوق کے مرکب کو آہ شوق میں　　اے سجن تیری نگہ مہمیز ہے

کیوں نہ ہر ذرہ رقص میں آوے　　جلوہ گر آفتاب سیما ہے

تعریف اس پری کی جسے تم سناؤ گے　　تا حشر اس کے ہوش کو اس میں نہ پاؤ گے

ولی کا کلام شوق واثر سے مملو ہے۔ ان کے ہاں زور کلام اور بلند خیالی غضب کی

پائی جاتی ہے۔ ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں ؎

پڑھتے ہیں ولی شعر ترا عرش پہ قدسی ‏ ‏ باہر ہے تری فکرِ رسا حدِ بشر سوں
گر کرے بحر پر غضب کی نظر ‏ ‏ ماہیاں جائیں جل کے بھتیر جل
ولی مجھ دل کی آتش پر نظر کر ‏ ‏ جہنم کی زباں پر الحذر ہے
گدا ہیں جو محبت کی گلی کے ‏ ‏ سدا وہ ہمسفر ہیں تجلی کے

ذیل کے اشعار میں حسن الفاظ سے زیادہ لطافت معنوی پائی جاتی ہے اور نازک خیالی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے ؎

ولی تو بحر معنی کا ہے غواص ‏ ‏ ہر اک مصرعہ ترا موتی کی لڑ ہے
دیکھ کر تجھ مکھ کی پر تو کو لے رشکِ آفتاب ‏ ‏ موج کی پانی نے ڈالی حگ میں زنجیر طلا
از بسکہ زندگی میں یوں محو ہوں ولی میں ‏ ‏ مشکل ہوا اجل کو کرنا سراغ میرا
تجھ مکھ کا رنگ دیکھ کنول جل میں جل گئے ‏ ‏ تیری نگاہ گرم سوں گل گل پگھل گئے
صافی ترے جمال کی کاں لگ بیاں کروں ‏ ‏ جس پر قدم نگاہ کے اکثر پھسل گئے
نظر کر کے تجھ مکھ کی صافی اپر ‏ ‏ ہوئی آرسی شرم سوں غرق آب
یاد سوں ساقی کے بس دن ہر پلک ہے شاخ تاک ‏ ‏ اشکِ حسرت اس اپر جیوں خوشۂ انگور ہے

الفاظ کی موزونیت، ان کا برمحل استعمال، اچھوتے استعاروں اور تشبیہوں، جاذب نظر ترکیبوں اور رعایت لفظی وغیرہ نے کلامِ ولی میں چار چاند لگائے ہیں۔ ولی نے صنعت ایہام اور ذومعنی الفاظ کا استعمال عہدِ محمد شاہی کے شعراء کے مقابلہ میں کم کیا ہے۔ اس وجہ سے ان کا

کلام صاف، سادہ، اور شستہ بھی ہے اگرچہ لفظی و معنوی صنائع و بدائع بھی بدرجہ اتم موجود ہیں مگر ان سے کلام میں کوئی قبح نہیں پیدا ہوتا بلکہ اس کے حسن میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ تشبیہ، استعارہ، حسن تعلیل اور مراعات النظیر وغیرہ کا استعمال کلام میں ایسا ہے جیسا کہ کھانے میں نمک۔ غرض کونسا سامان ہے جو ولی کی دوکانِ شاعری میں موجود نہیں۔ ان کی شاعری کا کمال لازوال ہے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں جن سے ان کے کلام کی متذکرہ بالا خصوصیات کی وضاحت ہو جائے گی ؎

تب سوں ہوا ہے دل مرا کان نمک اے بانک — جب سوں سُنیا ہوں شور میں تجھ حسن شور انگیز کا

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر — ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

دل صد پارہ تجھ پلک سوں ہے بند — خرقہ دوزی ہے کام سوزن کا

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سوں پیو کا — کرتا ہوں تب سوں ورد الف لام میم کا

ترا خطِ خضر رنگ اے شوخ — سلطان ہے خشکی و تری کا

نہیں واں آب غیر از آبِ خنجر — شہادت گاہِ عاشق کربلا ہے

ترا قد مصرعِ برجستۂ دیوانِ خوبی ہے — تری یو بیت ابرو شعر دستا ہے ہلالی کا

ولی کے عقائد کلیات ولی کے مطالعے سے اُن کے عقائد کے متعلق کافی روشنی پڑتی ہے۔

وہ ایک وسیع مشرب اور آزاد منش انسان تھے۔ مذہبی قیود اور جکڑبندیوں سے ہمیشہ بیزار رہے فرقہ بندی اوہام پرستی، اور مذہبی تعصب سے ان کا دامن پاک تھا۔ وہ مذہب کا احترام کرتے تھے۔ رسول پاک ؐ کی اُن کے دل میں سچی محبت تھی۔ اور اُن کی شان میں جوش عقیدت سے نعتیہ قصیدہ اور مثنوی بھی لکھی ان کو اپنی نعت گوئی پر فخر تھا وہ کہتے ہیں ؎

کیا ملک کیا انس و جن یہ جگ میں کس کو ہے سکت
خط بنا تجھ مکھ کے جو تفسیر قرآنی کرے

عارفاں بولیں گے جان و دل سوں لاکھوں آفریں
جب ولی تیری مدح میں گوہر افشانی کرے

رسول پاکؐ سے انہیں جو دلی عقیدت اور محبت تھی اس کا پتہ ان اشعار سے چلتا ہے

محمدؐ وہ کہ جس کے حق میں لولاک
کہا ہے خالقِ املاک و افلاک

وہی ہے باغ اقدس سرورِ دیں
کہ جس کے باغ کا رضواں ہے گلچیں

اسی کا ذکر ہے اے جانِ مومن
اسی کی یاد اطمینانِ مومن

دو عالم جسم وہ ہے جانِ عالم
نبیاں اُمرا وہ ہے سلطانِ عالم

دکھایا عاشقاں کو عشق کی راہ
کیا عارف کو عرفاں بیچ آگاہ

محبت کی عطا کر مئے پرستی
انہیں کی معرفت کی بخش مستی

ہوا جو کوئی اس گل سوں معطر
رہا وہ مست ہو تا روزِ محشر

سلامت روی، متانت، اور قناعت ان کے جواہر طبعی تھے۔ اُن کی آزاد مشربی اور وسعتِ نظر کی مثالیں جابجا ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی آزادروی اور جراءت رندانہ ان کے متعدد اشعار سے ظاہر ہوتی ہے۔ ایک شعر ہے ؎

گر ہوا ہے طالب آزادگی
بندمت ہو سبحہ او زنار میں

وہ حسن پرست بھی تھے۔ مگر حسن پرستی ہوسناکیوں سے پاک تھی۔ کیونکہ وہ عشق مجازی کو عشق حقیقی کا زینہ خیال کرتے تھے۔

لی کا فلسفہ محبت ولی ایک پرستار عاشق تھے۔ ان کے عشق کا دائرہ بے حد وسیع تھا۔ ان کے

نزدیک عشق و محبت سے زیادہ اہم کوئی چیز نہیں تھی۔ ان کا کلیات ان کی عاشق مزاجی اور حسن پرستی کا مرقع ہے کلام میں جو خاص درد اور حلاوت نمایاں ہے وہ ان کی حقیقی اور بے لوث محبت کی وجہ سے ہے۔ انہوں نے اپنی بے لاگ محبت کا اظہار کئی طرح سے کیا ہے۔ کہیں اپنے محبوبوں کے حسن کی دل کھول کر تعریفیں کرتے ہیں تو کہیں اُن کو بزرگوں کی طرح دعائیں دیتے ہیں۔ کبھی ان کی جدائی ان کے دردآشنا دل کو تڑپاتی ہے تو کبھی ان سے مل کر ان کا دل باغ باغ ہو جاتا ہے۔ انتہائے محبت جملہ علائق سے آزاد کر دیتی ہے۔ اور امتیاز من و تو بھی باقی نہیں رہتا۔ مشہور انگریزی شاعر کیٹس کی طرح ان کا فلسفہ بھی "حسن صداقت اور صداقت حسن ہے"۔ حسن حسن کی خاطر۔ اور محبت حسن کے لئے اور حسن محبت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ ان کی آنکھیں ہر شئے میں حسن کی متلاشی تھیں محبوبوں کی یاد اور ان کا حسن انہیں معشوق حقیقی کی طرف مائل کرتا تھا۔ غرض ہر سمت انہیں حقیقت اور حسن کی تجلیاں نظر آتی تھیں۔ ان کے حسب ذیل شعر اس خصوص میں قابل ذکر ہیں ؎

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا — بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا
ہوا ہے مجھ کو شمع بزم یکرنگی سوں یو روشن — کہ ہر ذرے اپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا
کرے عشاق کو جیوں صورتِ دیوار حیرت سوں — اگر پردے سوں وا ہووے جمال بے حجاب اس کا

ہر ذرۂ عالم میں ہے خورشیدِ حقیقی — یو بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

نہ جاؤں صحنِ گلشن میں کہ خوش آتا نہیں مجھ کوں — بغیر از ماہ رو ہرگز تماشا ماہتابی کا

ان کے دوست مختلف مذاہب کے پیرو تھے۔ ان کی رواداری کا یہ عالم تھا کہ وہ ہر فرقہ اور مذہب کے لوگوں کا کچھ ایسے پیرائے میں ذکر کرتے ہیں کہ فرقہ بندی کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا۔

کلیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس آزاد مشرب انسان کا دلی مدعا مختلف قوموں میں ارتباط و اتحاد پیدا کرنا تھا۔ اس خلوص کے ساتھ مختلف اہل مذاہب کو زندگی بسر کرتے دیکھ کر انہیں روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی۔ وہ اپنے اشعار میں ہندو مسلم اتحاد کی ترغیب دلاتے تھے۔ انہوں نے جہاں مسلمانوں کی شان و شوکت۔ ایران کی فصل بہار اور اسلامی تقدس کی تصویریں کھینچیں ہیں وہیں ہندوؤں کے تہواروں اور عبادت کا ذکر اور دیوالی کی روشنی کی بہار اور چہل پہل کے نقشے بھی کھینچے ہیں۔ وہ کہتے ہیں ؎

نزک قلعہ کے بارا گھاٹ ہے وہاں　　کہ دائم گلرخاں کی ہاٹ ہے وہاں
شہر بھیتر جو آوے نہان کا دن　　ہندو کی قوم کے اشنان کا دن
وہاں اشنان جب کرتا ہے عالم　　صبح اور شام جب کرتا ہے عالم
ہر اک جانب دیکھوں میں فوج در فوج　　تجلّی کے سمندر کی اٹھے موج

ہوئی ہے آرسی جوگن ترے مکھ کے تصور میں　　بھبوتی مکھ پہ کیا دم مارتی ہے خاکساری کا
نین دیول میں پتلی ہے و یا کعبہ میں اسود ہے　　ہرن کا ہے یوں نافہ یا کنول بھیتر بھنورا بست
تری انکھیاں کے حلقے میں دسے یوں نقش لوح روشن　　کہ جیسے ہند کے بھیتر لگے دیوے دیوالی کے

ولی جب اورنگ آباد میں تھے تو گجرات کے دوستوں کی یاد انہیں بے چین رکھتی تھی۔ اور جب وہ گجرات جاتے تو اورنگ آباد کے دوستوں کی یاد انہیں ستایا کرتی تھی۔ اس فراق میں جو سوز و گداز کے اشعار ان کی زبان سے نکلتے تھے وہ شوق و اثر سے مملو ہوا کرتے تھے۔

گجرات کے فراق سوں ہے خار خار دل　　بیتاب ہے سینے میں آتش بہار دل

مرہم نہیں ہے اس کے زخم کا جہاں منیں　　شمشیر ہجر سوں جو ہوا ہے فگار دل
اول سوں تھا ضعیف پہ پابستہ سوز میں　　جیوں بال ہے اگن کے اُپر بیقرار دل
ہجرت سوں دوستاں کے ہوا جی مرا گداز　　عشرت کے پیرہن کو کیا تار تار دل
ہر آشنا کی یاد کی گرمی سوں تن منیں　　ہر دم میں بیقرار ہے مثل شرار دل
مجمر نمن ہوا ہے بدن سوز ہجر سوں　　اس بند کی مثال ہے آتش سوار دل
تیرا فراق تھا دل و سینہ پہ مثل سل　　مدت سوں دل رہا تھا ترے غم میں پا بگل
دیکھا نہ تھا میں خواب میں آرام ایک تل　　تب سوں ہوا ہے محمل لیلیٰ کی شکل دل
جب سوں ترے خیال نے دل میں گزر کیا

شاید ان دوستوں کی محبت ہی نے انہیں وطن سے یہاں کھینچ لایا تھا۔ یا گجرات اور سورت کے حسن کی نظارہ بازی کے شوق میں ان کے ترک وطن کا راز مضمر تھا؛ کیونکہ ایک حسن پرست ہستی کے لئے اورنگ آباد میں خصوصاً عہد اورنگ زیب میں کیا دلچسپی ہو سکتی تھی؟ ولی نے مال و دولت عزیز و اقارب اور حُب وطن غرض ہر چیز حسن و عشق اور محبت پر قربان کر دی۔

اگرچہ ولی کو دکن سے زیادہ گجرات سے انس تھا۔ بلکہ جب کبھی ان کی بود و باش کے متعلق پوچھا جاتا تو جواب ملتا:۔

ہرگز ولی کے پاس تم باتاں وطن کی مت کہو　　جو نیہہ کے کوچہ میں ہے اسکوں وطن سے کیا غرض

تاہم کلیات میں کہیں کہیں وطن کی طرف اشارہ ضرور ہے ؎

ولی ایران و توراں میں ہے مشہور　　اگرچہ شاعر ملک دکن ہے

ولی کی نظر ایک مرشد و رہبر کی جویا تھی۔ یوں تو وہ خود ایک عارف اور صوفی منش تھے تاہم انہیں ایک ایسے مرشد کی تلاش ضرور تھی جو اُن کی رہبری کرتا۔ اور انہیں عشق حقیقی میں پایۂ کمال کو پہنچاتا یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف اے ولی
جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا

عیاں کر دل اُپر راز طریقت
سینہ پر کھول ابواب حقیقت

الٰہی رکھ مجھے تو خاک پا اہلِ معانی کا
کہ کھلتا ہے اسی صحبت سے نسخہ نکتہ دانی کا

ان کے اشعار میں وحدت الوجود کی جھلک بھی نظر آتی ہے مثلاً ؎

حسن تھا پردۂ تجرید میں سب سوں آزاد
طالبِ عشق ہوا صورت انسان میں آ

حسن دلبر کا خواب میں دیکھا
نورِ حق تھا حجاب میں دیکھا

خود فنا ہو کے ذات میں ملنا
یہ تماشا حباب میں دیکھا

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوا ہے مجھ کو شمع بزم یکرنگی سوں یو روشن
کہ ہر ذرّے اپر تاباں ہے دائم آفتاب اس کا

ہر ذرہ عالم میں ہے خورشید حقیقی
یوں بوجھ کہ بلبل ہوں ہر اک غنچہ دہاں کا

معلومات علوم اسلامی

کلام ولی کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ شاعر ہونے کے علاوہ ایک عالم اور فاضل بھی تھے ان کے کلام میں آیاتِ قرآنی اور احادیث کی طرف کافی اشارے موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا لکھنے والا معارف علوم اسلامیہ کے رموز و مسائل پر حاوی ہے۔ ذیل میں اس کے بعض اشعار نقل کئے جاتے ہیں:۔

وہی پائے مطلب راضیۃً مرضیۃً　　　محض للہ جگ میں جو اعمال بنہائی کرے

راضیۃ مرضیۃ:۔ پوری آیت ہے یاایھا النفس المطمئنۃ ارجعی الیٰ ربک راضیۃ مرضیۃ یعنے اے نفس مطمئنہ اپنے رب کی طرف خوش و خرم لوٹ جا۔ (یہ آیت سورۂ فجر میں آئی ہے)

تمام بات یسبح بحمدہٖ کے بحکم　　　زبان حال سے کرتے ہیں ذکر سبحانی

یسبح بحمدہٖ:۔ وان من شیئ الا یسبح بحمدہٖ کوئی شئے ایسی نہیں جو اللہ کی تسبیح و تحمید نہ کرتی ہو۔

اے ولی ترک کر یہ حرف دراز　　　کہ ہے خیر الکلام "قل و دل"

قل و دل:۔ خیر الکلام ما قل و دل۔ بہتر کلام وہ ہے جو مختصر اور مدلل ہو۔ یہ ایک مقولہ ہے جو کلام و منطق فصاحت و بلاغت کی کتابوں میں اکثر مستعمل ہے۔

مرا دل چاند اور تری نگہ اعجاز کی انگلی　　　کہ جس کی اک اشارت میں مجھے شق القمر دستا

شق القمر:۔ اقتربت الساعۃ وانشق القمر یہ سورۂ قمر کی ابتدا میں ہے اس کے معنی ہیں

ساعت آپہونچی اور قمر شق ہو گیا بعض لوگ اس واقعہ کو معجزۂ شق قمر کی طرف محمول کرتے ہیں۔ اور بعض اس سے قیامت کا شق قمر مراد لیتے ہیں۔

لامکاں پر بنا احمد جو نیا بٹھلایا　　تب ملائک نے وہیں صلو علیکم گایا

صلّو علیکم ۔ شب معراج میں رسول اللہ کو مخاطب کر کے فرشتوں نے صلو علیکم کی مبارکباد گائی تھی ۔ اسی کی طرف اشارہ ہے۔

حق نے لولاک لما حق میں محمد کے کہا　　ان سوا کو نسے مرسل نے یہ رتبہ پایا!

افلاک سب پیدا ہوئے لولاک کے الحان میں　　تجھ یاد سوں راحت اچھو لومومنا کی جان میں

محمد وہ کہ جس کے حق میں لولاک　　کہا ہے خالق املاک و افلاک

لولاک لما ۔ لولاک لما خلقت الافلاک یہ حدیث موضوع ہے لیکن اس کا مطلب درست ہے اس کے معنی ہیں اے نبی اگر تم نہ ہوتے تو میں افلاک کو پیدا نہ کرتا آں حضرت صلعم تمام کائنات کی علت غائی ہیں۔

سخن کا کلمہ منور نور آیت فال مصحف ہے　　کہ اہل نامراداں پر دعا ہے ہل اتی حافظ

هَلْ اَتٰی ۔ هَلْ اَتٰی عَلَی الْاِنْسَانِ حِیْنٌ مِّنَ الدَّهْرِ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰی حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ (سورۂ دہر کی ابتدا میں ہے) اس سورۃ میں حضرت علیؓ کی تعریف کی گئی ہے۔

رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب　　زیور لب ذکر سبحان الذی اسریٰ کروں

سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی ۔ سُبْحَانَ الَّذِیْ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ

اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصیٰ (یہ آیت سورۂ بنی اسرائیل کی ابتدا میں ہے) اس سے معراجِ نبوی پر استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے معنی ہیں پاک ہے وہ ذات برتر جس نے ایک شب اپنے بندے کو مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی۔

اے ماہ جبیں مہر لقا تیری جبیں دیکھ کرتا ہوں ہر اک دم منیں دم ناد علی کوں

نَادِ عَلِی :- ایک دعا ہے جس کی نسبت یہ اعتقاد ہے کہ جبرئیل نے رسالتآب کو خدا کی جانب سے پہنچائی تھی کہ جنگ اور خوف کے موقع پر پڑھی جائے جس کی پہلی آیت یہ ہے۔ "نادِ علی مظہر العجائب" یعنی ندا کرو علیؑ کو جو مظہر العجائب ہیں۔"

چہرۂ گلرنگ و زلف موج زن خوبی منیں آیت جنات تجری تحتہا الانہار ہے

جَنَّاتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ :- یہ آیت قرآن شریف میں متعدد جگہ آئی ہے۔ یعنے جنّت کے باغ کے نیچے سے نہریں بہتی رہیں گی۔

یٰسین وطٰہٰ والضحیٰ نازل ہوئے تجھ شان میں واللیل اور والشمس ہے تجھ زلف و مکھ کے درمیاں

یٰسٓ۔ طٰہٰ۔ وَالضُّحیٰ وَالَّیْلِ وَالشَّمْسِ } یہ الفاظ متشابہات سے ہیں۔ ان الفاظ سے آنحضرت صلعم کی ذات مراد لیتے ہیں۔

الٰہی دل اُپر دے عشق کا داغ لیقس کے نین میں سٹ کحل مازاغ

مَا زَاغَ :- مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰی (یہ آیت سورۂ النجم میں ہے) اس کے معنی ہیں آپ کی آنکھ (دیدار الٰہی کے وقت) نہ جھپکی اور نہ سرکشی کی۔

دیوانِ ازل بیچ خدا لے بے چوں یہ حکم کیا عام کہ "ہاں کن فیکون"

کُنْ فَیَکُوْن :۔ اِنَّمَآ اَمْرُہٗٓ اِذَآ اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (یہ آیت سورۂ یٰس کے آخر میں ہے یعنی خدائے تعالیٰ جب کسی کام یا شئے کی تخلیق کا ارادہ کرتا ہے تو وہ کہتا ہے "ہو جا" اُسی وقت وہ شئے ہو جاتی ہے۔

اے کعبہ رو کھڑا تو ہوا جیوں ادا کیا ت   بولے اکابراں نے کہ "قد قامت الصلوٰۃ"

قَدْ قَامَتِ الصَّلوٰۃ :۔ نماز سے قبل یہ الفاظ کہے جاتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں نماز قائم ہو گئی

خوبیٔ اعجاز حسن یار اگر انشا کروں   بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں

یَدِ بَیضَا :۔ موسیٰ کا معجزہ۔ وہ اپنا ہاتھ ہمیشہ آستین میں چھپائے رکھتے تھے جب باہر نکالتے تو وہ نورانی ہوا کرتا تھا۔ ید۔ ہاتھ۔ بیضا۔ نورانی۔ روشن۔

مُوسیٰ :۔ فرعون کے زمانہ میں حضرت عیسیٰ سے پہلے کے عظیم المرتبت پیغمبر۔ توریت انہیں پر نازل ہوئی۔ اس زمانے میں کاہنوں کا دور تھا۔

طُوْر :۔ ایک عصا تھا آپ کا جسے زمین پر پھینک دینے سے سانپ بن جایا کرتا تھا۔ کوہِ طور پر خدا نے آپ کو اپنا جلوہ دکھایا۔ اور باتیں کیں۔ اس لئے آپ کو کلیم اللہ بھی کہا جاتا ہے۔

تصوف و عرفان کی اور دیگر مذہبی اصطلاحیں | ہم نے پہلے بھی ذکر کیا ہے کہ وؔلی کے کلام میں تصوف، وعرفان اور عشق حقیقی کی کافی جھلکیں موجود ہیں۔ اس موضوع پر اس مجموعہ میں چونکہ ایک تفصیلی مضمون شامل کیا گیا ہے اس لئے ہم یہاں صرف چند شعر ایسے پیش کر دیں گے جن کے مطالعہ سے معلوم ہوگا کہ وؔلی کو تصوف اور عام مذہبیات کے متعلق کافی معلومات حاصل تھیں۔

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسنِ بے حجاب اس کا   بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اس کا

ہوا تیرے خیالاں سے سراپا ۔۔۔ مرا دل مثل فانوس خیالی
بعد حمدِ خدائے بے ہمتا ۔۔۔ یاد کر نعت سید مرسلؐ
بعد اس آفتابِ انور کے ۔۔۔ چار ہیں اہل علم و اہلِ عمل
عشق میں لازم ہے اول ذات کو فانی کرے ۔۔۔ ہو فنا فی اللہ دائم یادِ یزدانی کرے
خود فنا ہو کے ذات میں ملنا ۔۔۔ یہ تماشا حباب میں دیکھا
بجا ہے گر کرے پرواز رنگ چہرۂ عاشق ۔۔۔ ہوا ہے ذوق موہن کو لباسِ زعفرانی کا
پھیکی لگے اس کو شانِ دولت ۔۔۔ چاکھیا جو مزہ قلندری کا
کرتا ہے اس کی زلف کی تعریف اے ولی ۔۔۔ جو ہے مرید سلسلۂ مستقیم کا
نہ ہوئے چرخ کی گردش سے اسکے حال میں گردش ۔۔۔ بجا ہے قطب کے مانند استقلال عاشق کا
در رواوی حقیقت جس نے قدم رکھا ہے ۔۔۔ اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا
تسبیح ترے زلف کو کہتے ہیں اے صنم ۔۔۔ یک تار دے کہ رشتۂ زنار کر رکھوں
آسماں اوپر نہ بوجھو چادر ابرِ سفید ۔۔۔ جانماز زاہد عزلت نشیں برپا دسے ہے
خاکساری جس کو سلطانی ہے اس عالم منیں ۔۔۔ کاسۂ خاکی اسے جیوں چینی فغفور ہے
ہم کو شفیع محشر وہ دین پناہ بس ہے ۔۔۔ شرمندگی ہماری عذر گناہ بس ہے
ہر چند اے ولی ہوں میں غرق بحر عصیاں ۔۔۔ مجھکو شفیع محشر حضرتؐ کی آل بس ہے
جب سوں وہ آتا ہے ہمراہ رقیب ۔۔۔ دردمنداں کا مکاں اعراف ہے
بولے ہیں اہل دل سب یہ بات سُن ولی سوں ۔۔۔ عارف کا دل بغل میں قرآن ہیکلی ہے

ادبی معلومات

علومِ مذہبی کے علاوہ ولی کے کلام کا مطالعہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ ادب فارسی و عربی سے بھی کماحقہٗ واقف تھے شعراء و مصنفین کی خصوصیات اور تاریخی تلمیحات کا بھی علم تھا۔ نقدِ سخن میں بھی کافی دخل تھا۔ اور ادبیات کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ذیل کے اشعار سے ان کی ادبی معلومات کا علم حاصل ہوتا ہے:-

جو ہوا رازِ عشق سوں آگاہ وہ زمانے کا فخرِ رازی ہے
گر نہیں رازِ فخر سوں آگاہ فخر بے جا ہے فخرِ رازی کا

فخر رازی:- امام فخر الدین رازی مصنف تفسیرِ کبیر وغیرہ۔ زبردست متکلم اور مفسر اور فقیہ تھے ابو عبداللہ محمد بن عمر بن الحسین الرازی نام تھا۔ ۶۰۶ھ میں وفات پائی۔

معرکے میں عشق کے ہر بوالہوس کا کام کیا دیکھ احالت کیا ہوئی منصور سے سردار کی

منصور:- منصور حلاج۔ ایک صاحبِ دل جس نے خاص کیفیت میں انا الحق کہا تھا۔ علمائے شریعت نے کفر کا فتویٰ دے کر دار پر چڑھا یا۔

نہ ڈھونڈو شہر میں فرہاد و مجنوں کا ٹھکانا تم کہ ہے عشاق کا مسکن کبھو صحرا کبھو پربت

مجنوں:- قبیلہ بنی عامر کا ایک فرد۔ جو اپنی بنت عم لیلیٰ پر بچپن ہی سے عاشق تھا۔ اس کا اصل نام قیس ہے۔ عاشقانہ صفات کی وجہ سے مجنوں کہلایا جاتا ہے اس کردار نے بطور تصوری عاشق کے نسانوی حیثیت اختیار کر لی ہے۔

تو سر سے قدم تلک جو ملک میں گویا ہے قصیدہ انوری کا

انوری :- قصیدہ کا پیغمبر۔ سلطان سنجر کا درباری شاعر۔ کوئی ہمعصر یا پیش رو اس کا مقابل نہیں۔

لب پہ دلبر کے جلوہ گر ہے جو خال   حوض کوثر پہ جیوں کھڑا ہے بلالؓ

بلالؓ :- رسول اللہ کے زمانہ کے خوش گلو موذن حبشی تھے۔ اسی مناسبت سے شعراء بعض وقت اپنے محبوب کے چہرہ کے خال کو ان سے تشبیہ دیتے ہیں۔

ہم پاس آ کے بات نظیری کی مت کہو   رکھتے نہیں نظیر ایس کی سخن میں ہم

نظیری :- نیشاپوری۔ اکبری عہد کا شاعر۔ غزل کا مذاق غالب تھا۔ زبان میں نہایت گھلاوٹ اور نزاکت ہے۔ ان کے کلام میں اختصار اور زور نہیں۔

یوں شعر تیرے لے ولی مشہور ہیں آفاق میں   مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا

بلبل تبریز :- شمس الدین تبریزی مولانا رومی کے پیر۔ مولانا نے ان کی محبت میں ایک دیوان لکھا اور تبریزی ہی کے نام سے منسوب کیا۔ (دیوان تبریز)

بزنگ لالہ نکلے جام لے کر اس زمیں سے جم   اگر بخشے تکلم سوں مئے جاں بخش جام اس کا

جم :- جمشید ہی کو جم کہتے ہیں۔ زرہ کا موجد۔ اس نے فن عمارت کو ترقی دی۔ جہاز رانی ایجاد کی۔

ولی لکھتا ہے تیری مست انکھیاں دیکھ لے ساقی   بیاض گردن مینا اُپر دیوان جامی کا

مولانا جامی :- فارسی کے مشہور صوفی منش شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں اخلاق۔ موعظت اور حکمت کے اہم معنی ہیں۔

حق ترا جگ میں کیوں نہ ہو حافظ   کہ تجھے حافظ کلام کیا!

حافظ :- خواجہ حافظ شیرازیؒ نے قرآن مجید حفظ کیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے حافظ تخلص رکھا۔

فن قرأت میں کمال رکھتے تھے تفسیر کشاف پر حاشیہ لکھا۔ فارسی غزل گوئی میں ان کا ہمعصر نہیں۔ خواجہ حافظ نے ۷۹۲ھ میں وفات پائی۔ خاک مصلے تاریخ ہے جس میں ایک عدد کی کمی ہے صاحب دیوان تھے۔

گر نہیں فریاد سنتا اس جہاں میں بوعلی　　　چہرۂ زرین پہ طرہ دار یاران الغیاث
بوعلی سینا اگر دیکھے اسے　　　قاعدہ حکمت کے سب جائے بسر

بوعلی سینا: ارسطو کے ممتاز متعلمین میں سے ہے۔ ارسطو کا ہمسر مانا جاتا ہے۔

عرفی وانوری وخاقانی　　　مجھ کو دیتے ہیں سب حساب سخن

عرفی: فارسی قصیدہ گو شاعر۔ خیال بندی مضمون آفرینی اور دقت پسندی اس کی خصوصیات ہیں فلسفیانہ اور حکیمانہ مسائل حل کرنے کا ملکہ حاصل تھا۔ ظہوری کا ہمعصر۔

خاقانی: مشہور فارسی قصیدہ گو شاعر (۱۱۰۶ تا ۱۱۸۵) شیروان شاہ کا ملک الشعرا تھا۔ علاوہ قصائد کے ایک مثنوی تحفۃ العراقین اس کی یادگار ہے۔

مجھ کو پہنچی ہے آرسی سوں یہ بات　　　صاف دل وقت کا سکندر ہے

سکندر: سکندر ذوالقرنین۔ آئینہ کا موجد۔ آب حیات کی تلاش میں خضر کے ساتھ ظلمات میں گیا تھا

ترا مکھ مشرقی حسن انوری جلوہ جمالی ہے　　　نین جامی جبیں فردوسی وابرو ہلالی ہے

فردوسی: غزنوی عہد کا شاعر۔ محمود کی فرمائش سے جس نے شاہنامہ لکھا۔ یہ "ابیات" کا پیغمبر مانا جاتا ہے۔

تو ہی ہے خسرو روشن ضمیر و صائب و شوکت　　　ترے ابرو پہ مجھ بیدل کو طغرائے وصالی ہے

صائب: "مثالیہ کے نام سے شاعری کی ایک نئی صنف ایجاد کی۔ جن کو مصوّر (Illustrative Poetry) نظم کہا جاسکتا ہے۔ ان کے کلام میں اخلاق و موعظت کا عنصر زیادہ ہے۔

ادبیات عالیہ کا ذکر کلام ولی میں نہ صرف شاعروں اور ادیبوں کا ذکر ہے بلکہ ایسی تصنیفات، و تالیفات کے نام بھی ملتے ہیں جو اس زمانہ میں متداول اور مقبول تھیں۔ حسب ذیل اشعار میں ایسی بہت سی کتابوں کے نام ملتے ہیں جن میں سے اکثر اس زمانہ کے نصاب تعلیمی میں بھی شریک ہوں گی۔ ان اشعار سے نہ صرف ولی کی معلومات کے متعلق ہمارا علم وسیع ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ کا نصاب تعلیمی کیا تھا اور کس قسم کی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔

بیاں زلف بدیعی سے ہے سعد الدین کا مطلب ابھی تک تم نہیں سمجھے مطول کے معانی کو

پڑھنا مطول کا کیا اس نے درس میں مختصر تیری زبان سوں جو سنا علم معانی کا بیاں

پیچ اس زلف کا نہ پاوے کوئی گر مطول پڑھے دگر اطول

مطول: مصنفہ سعد الدین تفتازانی جو آٹھویں صدی میں گذرے ہیں۔ اکابر علمائے اسلام سے تھے۔ متاخرین علم کلام میں ان کا ایک خاص درجہ ہے اکثر ان کی کتابیں نصاب کلام میں ہیں اور یہ کتاب علم معانی میں ہے مصنف نے ۷۹۲ھ میں وفات پائی۔

دیکھنا ہر صبح تجھ رخسار کا ہے مطالع مطلع الانوار کا!

مطلع الانوار:۔ امیر خسرو کا مشہور قصیدہ ہے۔

کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر   حرف حرف اس مخزنِ اسرار کا

مخزن اسرار:- نظامی گنجوی کی پانچ مثنویوں (خمسہ) میں سے ایک ہے جو بہت مشہور ہے۔

یو خط کا حاشیہ گرچہ ولی ہے مختصر لیکن   مطول کے معانی کا تمامی مدعا دستا

حاشیۂ مطول:- مطول تفتازانی کا حاشیہ ہے از عصام۔

یوں کہا دیکھ درس شاہد راز   چھوڑ دے درس قطبی و نہل

قطبی:- شمسیہ کی شرح قطبی منطق میں ایک مشہور کتاب ہے اس کے مصنف قطب الدین رازی نے ۷۶۶ھ میں وفات پائی۔

نہل:- ایضاً فی شرح وافی یہ کتاب نحو میں ہے یہ کتابیں پہلے درس میں رہا کرتی تھیں۔

ان تمام مثالوں کے مطالعہ سے واضح ہوجاتا ہے کہ ولی ایک ان پڑھ شخص نہیں تھے۔ اُن کی آزادروی اور پیہم سیر وسیاحت کی وجہ سے یہ خیال نہ کرنا چاہئیے کہ وہ علم وفضل سے بے بہرہ اور علوم متعارفہ سے ناواقف تھے ان کا مطالعہ وسیع تھا اور مطالب ومعانی کی جو گہرائیاں ان کے کلام میں نظر سے گزرتی ہیں وہ ان کے وسیع مبلغ علم ہی کا ثبوت ہیں۔

ولی کا فنِ شاعری

از

جہاں بانو بیگم

بی۔ اے (عثمانیہ)

ولی کا فنِ شاعری

ادب یا لٹریچر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک شعر و شاعری، دوسرے سائنس۔ شعر و شاعری میں تخیل کی حکومت ہے۔ اور دنیائے سائنس میں دلیل کا سکہ چلتا ہے۔ ناول اور ڈرامہ شاعری کی قلمرو میں پھلتے پھولتے ہیں۔ تاریخ اور سوانح عمری سائنس کے ذیل میں شامل ہیں۔ شاعری کا میدان اندرونی خیالات ہیں۔ سائنس کی بنیاد بیرونی صداقتوں پر رکھی جاتی ہے۔ درخت سے پھل ٹوٹ کر زمین پر گرتا ہے۔ سائنسدان اسے صاف طور پر دیکھتا ہے۔ اور نتیجہ کتاب میں نوٹ کرتا ہے مگر انسان کیسے عروج حاصل کرتا ہے۔ اور کن غلطیوں کے باعث اس کا عروج تباہ و برباد ہو جاتا ہے، اسے دیکھنا سمجھنا اور پھر دوسروں پر واضح کرنا تخیل کا کام ہے سائنسداں کا نظریہ دنیا فوراً تسلیم کر لیتی ہے لیکن جب کوئی باکمال شاعر جذباتِ اندرونی کا کوئی راز حاصل کر لیتا ہے اور اُسے دنیا کے سامنے پیش کرتا ہے تو لوگ اس کی صداقت میں شبہ کرنے لگتے ہیں۔ حالانکہ تخیل کا سنگِ بنیاد ہمیشہ صداقت ہوتا ہے۔ جذبات کی سرکشی عقل کے قانون کو تسلیم نہیں کرتی۔ اکثر یہی ہوتا ہے کہ عقل کا فتویٰ کچھ ہے جذبات کا تقاضہ کچھ ہے۔ اور بالعموم اس پُر لطف جنگ میں میدان اکثر جذبات ہی کے ہاتھ رہتا ہے۔ بڑے سے بڑے خشک مزاج، اور نفس کش فلسفی واقعات سے وہ اثر لیتے ہیں جو

فلسفیانہ خیالوں کے بالکل مخالف ہوتا ہے۔ شاعرانہ جذبات اردو شاعری کی جان ہیں۔ اور شاعر ان کیفیات پر دل کھول کر بحث کرتا ہے۔

ایک فاضل انگریز کا قول ہے The human mind is essentially illogical یعنی "انسانی دماغ اصلاً غیر منطقی ہے"۔ ہر شخص کا تجربہ اس قول کی تصدیق کرتا ہے۔ وہی چیز کبھی ہم کو پسند ہوتی ہے۔ اور کبھی ناپسند۔ اسی بات سے ہم کبھی خوش ہوتے ہیں اور کبھی ناخوش کبھی ابدی زندگی کی آرزو ہوتی ہے کبھی فوری موت کی تمنا۔ کبھی ہماری طبیعت بلندی کی طرف مائل ہوتی ہے کبھی پستی کی طرف جھکتی ہے۔ کبھی سر میں غرور سماتا ہے۔ کبھی طبیعت میں انکسار آجاتا ہے۔ کبھی اپنے علم پر ناز ہوتا ہے۔ کبھی اپنے جہل پر شرم آتی ہے۔ کبھی اپنی طبیعت پر اکڑتے ہیں کبھی اپنی کمزوری سے دبتے ہیں۔ کبھی اپنے اختیارات کے زعم میں آجاتے ہیں۔ کبھی اپنی مجبوریوں کا احساس افسردہ و مضمحل کر دیتا ہے۔ کبھی ہر چیز پر پیار آتا ہے۔ کبھی اپنی ہستی سے بھی دل بیزار ہو جاتا ہے۔ کبھی دل کی ترنگ کا یہ رنگ ہے کہ ایک ہجوم خلائق ہو اور ہم ہوں۔ کبھی طبع میں یہ موج سمائے کہ بس

رہیئے اب ایسی جگہ چل کر جہاں کوئی نہ ہو

اکثر و بیشتر اسی طرح کی متضاد کیفیتیں ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتی ہیں۔ مگر اوروں کے یہاں یہ دل کی دل ہی میں رہ جاتی ہیں اور دنیا کو ان کی خبر ہی نہیں ہوتی لیکن شاعر کا کلام اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ جہاں یہ سب تاثرات نظر آتے ہیں مگر اس مقام پر یہ سوال ہو سکتا ہے کہ "شاعر کو جو بات لکھنی ہے اور جو واقعہ بیان کرنا ہے اس کو صاف صاف لفظوں میں کیوں نہیں ادا کر دیتا۔ یہ گل و بلبل کو بیچ میں کیوں ڈالتا ہے؟" سوال دلچسپ ہے۔ مگر شاید جواب بھی کچھ اس سے زیادہ دلچسپ ہو سکتا ہے

بعض اوقات رعنائی تخیل کے لئے اس کو اپنے پاؤں اسقدر پھیلانے پڑتے ہیں کہ جذبات کی چادر کے ٹکڑے اُڑ جاتے ہیں۔

شاعری پیغمبری کا ایک جزو مانی جاتی ہے۔ شاعری بیشتر موسیقی ہے۔ شاعری کی زبان کا پیدا کرنا ایک زبردست قوت ہے۔ یہ قلم کی وہ سہمگیں طاقت ہے جس سے تلواریں پناہ مانگتی ہیں۔ دنیا ــــ شاعر کی نگاہ میں ایک دلکش خواب ہے۔ اس کا سینہ گدازِ عشق سے معمور ہے۔ وہ الفاظ کا ایک کامیاب مصور ہے اور جمالیاتی تصورات کا نقاش !

انگلستان کے مشہور ادیب گولڈ سمتھ کا مقولہ ہے "شاعر دراصل وہ ہے جس کے اطمینانِ قلب کو ایک زبردست بھونچال (جو انسان کی پرسکون زندگی کے ساکت سے ساکت سمندر میں قیامت کا طوفان متلاطم کر دے) متزلزل نہ کر سکے۔ اور ایک نازک سے نازک شیشے ایک چھوٹے سے چھوٹے چینی کے برتن کی صدائے شکست اُس کے آبگینۂ دل کو چکنا چور کر دے"!

عرب میں جب کوئی شاعر پیدا ہوتا تھا تو ہر طرف سے مبارکباد کی سفارتیں آتی تھیں خوشی کے جلسے کئے جاتے تھے۔ قبیلہ کی عورتیں جمع ہو کر فخریہ گیت گاتی تھیں قبیلہ کی عزت و شان دفعتاً بلند ہو جاتی تھی۔ ایک ایک شعر ایک قبیلہ یا ایک شخص کا نام قیامت تک کے لئے زندہ کر دیتا تھا۔ شاعر پاکیزہ تخیلات بڑے بڑے زاہدوں کے "صعوبات لاطائل" سے کتنے اچھے رہے !

فلاسفۂ یونان کہتے ہیں شعر خیالی باتیں ہیں جن کو واقعیت اور اصلیت سے تعلق نہیں۔

قدرتی موجودات یا اس کے واقعات کو دیکھ کر جو خیالات شاعر کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اُنکو وہ اپنے مطلب کے موقع پر موزوں کر دیتا ہے۔ اس خیال کو سچ کی پابندی نہیں ہوتی۔ مولانا آزاد آبِ حیات میں

کہتے ہیں شاعر صبح کا نور ظہور دیکھتا ہے تو کبھی کہتا ہے دیگ مشرق سے دودھ اُبلنے لگا۔ کبھی کہتا ہے
دریائے سیاب موج مارنے لگا۔ کوئی مشرق سے کافور اُڑاتا آتا ہے۔ صبح تباشیر بکھیرتی آتی ہے۔
یا مثلاً سورج نکلا اور کرن ابھی اس میں نہیں پیدا ہوئی۔ وہ کہتا ہے سنہری گیند ہوا میں اُچھالی
ہے۔ صبح طلائی تھال سر پہ دھرے آتی ہے۔ کبھی مرغانِ سحر کا غل۔ اور عالم نور کا جلوہ۔ آفتاب کی
چمک دمک اور شعاعوں کا خیال کر کے صبح کی دھوم دھام دکھاتا ہے اور کہتا ہے بادشاہِ مشرق
سبز خنگ فلک پر سوار۔ تاج مرصع سر پہ رکھے۔ کرن کا نیزہ لئے مشرق سے نمودار ہوا۔ شام کو شفق
ا بہار دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ مغرب کے چھپر کھٹ میں آفتاب نے آرام کیا۔ اور شنگرفی چادر تان کر
ور ہا۔ کبھی کہتا ہے جامِ فلک خون سے چھلک رہا ہے۔ نہیں مغرب کے ایوان میں آگ لگ گئی ہے
روں بھری رات میں چاند کو دیکھتا ہے تو کہتا ہے۔ لاجوردی چادر میں ستارے ٹنکے ہوئے ہیں۔ دریا
میں نور کا جہاز چلا جاتا ہے اور روپہلی مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں۔ غرض ایسی ایسی باتیں ہیں کہ نہایت
ف دیتی ہیں صنعت گاہِ عالم میں نظم ایک عجیب صنعت صنائع الٰہی سے ہے۔" شعر کا وہ وصف خاص ہے جس کو
ب موزونیت کہتے ہیں۔ کلام میں زور زیادہ ہو جاتا ہے مضمون میں ایک ایسا جادو بھر جاتا ہے کہ اثر کا
ز دل پر کھٹکتا ہے۔

نثر ــــ اپنی شائستگی اور تکلف کے بوجھ سے گراں بار تھی نظم نے اس کی زندگی میں قدم
لر اس میں ایک پُر کیف ہلچل ڈال دی۔ اس کو شگفتہ اور ہر دلعزیز بنا دیا۔ ڈاکٹر تاثیر نے شاعر ایران
م) کی ایک رباعی کا اس طرح ترجمہ کیا ہے۔ صبح کی آمد شاعرانہ ہنگاموں سے کیسی پُر کیف

؎

اب جاگ کہ شب کے ساغر میں سورج نے وہ پتھر مارا ہے
جو مئے تھی وہ سب بہہ نکلی ہے جو جام تھا پارا پارا ہے
مشرق کا شکاری اُٹھا ہے کرنوں کی کمندیں پھینکی ہیں
اک پیچ میں قصر اسکندر اک پیچ میں قیصر وارا ہے

شاعرِ عرب کا تخیل — ''صبح ہوتی جاتی ہے۔ اور فجر کی آنکھوں سے سیاہی کا سُرمہ بہتا جاتا ہے'' مچھلی سمندر میں خاموش ہے۔ درندے صحرا کی خاردار خشکی پر شور مچا رہے ہیں۔ پرندے ہوا میں نغمہ ریز ہیں لیکن شاعر کے دل میں سمندر کی خاموشی، زمین کا شور اور ہوا کا نغمہ —— یہ تینوں کیفیات بیک وقت موجود ہیں —— شاعر روحانی قوتوں کا مصوّر ہے۔ اُس کی روح میں آٹھوں پہر ہلچل رہتی ہے۔

اُس کی تخیل کی دنیا ہی انوکھی ہے۔ کہیں اس کی مرضی یہ ہے کہ چاندنی رات ہو۔ ایک چھوٹے سے بجرے میں پھول ہی پھول لدے ہوں۔ ان پھولوں میں بیٹھا نہایت لطافت و نزاکت سے وہ بربط بجا رہا ہو۔ بجرا پانی کی پُرسکون سطح پر لہریں لیتا چلا جا رہا ہو۔ یکایک دریائے زندگی کا کنارہ آجائے اور وہ خوش خوش پار اُتر جائے۔

کبھی اُس کی کوئی شام کسی ندی کے کنارے گذرتی ہے۔ وہ بیٹھا ہوا ہے مبہوت، ساکت، اُس کی نگاہوں میں ندی کا کنارہ ایک رنگین تصویر معلوم ہوتا ہے۔ فضائے بسیط کی خاموشی کسی کی یاد کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ دریا رنگین دوپٹہ اوڑھے ہوئے دور آسمان سے جا ملا ہے۔ آفتاب کی رنگین نڈھال کرنیں مغربی وادی کی گھاٹیوں میں منہ چھپا رہی ہیں —— رفتہ رفتہ آسمان کا نیل ڈھلنے لگا

ـــــ تاروں کا عکس سطحِ آب پر رقصاں ہو گیا ـــــ! لیکن اُس کے نزدیک زندگی میں صرف پھول پھل ہی پھول نہیں ہیں اُس کے ارد گرد کانٹے بھی ہیں۔ زندگی محض ہنسنے اور گانے سے وابستہ نہیں ہے اس میں رونے اور پیٹنے کا بھی عنصر موجود ہے۔ زندگی صرف محبت کرنا اور کامیاب مرجانا ہی نہیں ہے۔ اس میں جدوجہد کے بعد بھی ناکامیاں بھری ہیں۔ اس کی کشتیٔ حیات جب تک موجوں کے تھپیڑوں سے نہ کھیلے ساحل سے لطف اندوز نہیں ہوتی۔ اس کے بعض نغمے ایسے بھی ہیں جن کے لئے نغمے کہلانا ذِلت ہے جب تک وہ فضائے ہستی میں نہ گونجیں۔ کائنات سے نہ ٹکرائیں آسمان و زمین ایک نہ کر دیں ـــــ!

اگر زندگی میں صرف خوشیوں کے سیلاب آئے ہوئے ہوں۔ کامیابی کی فراوانیاں ہوں مگر جب تک زندگی کی لہروں پر شاعری کے قوسِ قزح کا عکس منعکس نہ ہو زندگی ایک تردد ہے بے پایاں ایک ملال ہے عمیق۔!!

کوئل کی آواز' جو اس غریب کا تنہا ذریعہ مسرت و شادمانی ہے۔ پپیہے کی آہ' شاعر کا نالہ' اور گل کی واشدگی' یہ سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ سب پریشانیٔ خاطر اور مجبوریٔ محبت کی نشانیاں ہیں ـــــ اگر آج شاعری نہ ہوتی تو یہ راز سربستہ ہی رہتا تاکہ کائنات کا مفہوم کیا ہے۔

شعر' الفاظ' وزن' نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے۔ شعر کی لطافت' زبان کی درستی' محاورہ کا صحیح استعمال' رمز و کنایہ قصص و تلمیح صنائع کا ایک دفترِ بے پایاں' تشبیہات کا ایک جوئے رواں' ـــــ حسن کا ذکر ہو تو یوسف موجود ہوں۔ عمر کا بیان ہو تو حضرتِ نوح سامنے ہوں ـــــ یہ شاعری کی انجیل ہے ـــــ

شاعری بہ اعتبار جذبات، ایک خوبصورت گلدستہ ہے جس کی ساخت میں نہایت نازک پھول پتیاں صرف ہوئی ہیں ــــ جس طرح پھول کی پتیوں میں نازک رگیں، نسیں اور باریک نقش و نگار ہوتے ہیں ــــ شاعر کا دل و دماغ بھی ہر طرح کی لطافتوں اور نزاکتوں کا مخزن ہوتا ہے جس کے بیل بوٹے قدرت کی بہترین نقاشی ہیں ــــ شاعر کی ایک آہ جو دل سے نکلی ہو، ایسی ہزار صوفیانہ ریاضتوں اور اعمال پر بھاری ہے، جن میں شائبۂ خلوص نہ ہو ــــ

آہ شاعری ــــ تو فسانۂ زندگی ہے!!

شاعر کی آنکھ سے نکلا ہوا ایک آنسو، جس نے شعر کی شکل اختیار کر لی ہے!

ایک پُر کیف خواب اور نغمہ، جو شاعری کے سینہ کو چیر کر پھوٹ نکلا ہے۔ ایک دلآویز خواب جو شعر کی شکل میں جلوہ آرا ہے۔ شاعر کے قلب کی گہرائیوں سے نکلا ہوا ایک شفاف چشمہ جس کی روانی نے سنگین خس و خاشاک کو بھی نیست و نابود کر دیا ہے۔ ایک الفاظ کی مرصع تصویر جس نے دیکھنے اور سننے والے کو مبہوت کر دیا۔ الفاظ سے تراشا ہوا ایک بہترین شاہکار جس کے ہر پہلو سے شعریت برس رہی ہے۔

کیفیاتِ قلب اور جذباتِ دل کو شاعر جس والہانہ انداز سے پیش کرتا ہے یہ صرف اسی کا حصہ ہے۔ اور اس حصہ سے اردو شاعری کا باوا آدم اور غزل گوئی کا مردِ میدان ولی اورنگ آبادی سب سے زیادہ بہرہ مند ہوا ہے جس کی نسبت عثمانیہ کے ایک شاعر کا یہ خیال ہے ؎

ابھی نا آشنائے لذتِ گفتار تھی دنیا　　اسیرِ خامشی تھی، بار تھی، آزار تھی دنیا

کہ دفعتاً آسمان و زمین سے مبارکباد یوں کے شور اٹھے۔ ولی کی آمد پہ ستاروں نے تہنیت و تبریک کے نغمے سنائے۔ آزاد آبِ حیات میں اس خوش آیند واقعہ پر یوں روشنی ڈالتے ہیں[۱]ــ

"نظم اردو کے عالم کا پہلا نوروز ہے نفس ناطقہ کی روح یعنی شاعری عالم وجود میں آئی تھی۔ مگر بچوں کی نیند بڑی سوتی تھی ولی نے آکر ایسی میٹھی میٹھی آواز سے غزل خوانی شروع کی ہے کہ اس بچے نے ایک انگڑائی لے کر کروٹ لی۔ اور اثر اس کا دفعۃً حرارت برق کی طرح دل دل میں دوڑ گیا۔ گھر گھر شاعری کا چرچا ہے۔ جس امیر اور جس شریف کو دیکھو شعر کی سعونج میں غرق بیٹھا ہے۔ اس دور میں ولی تو مجلس کی شمع ہیں۔ اور اہل مجلس دلّی اور دکن کے شریف و نجیب فصیح زبان ہیں کہ جو کچھ دیکھتے ہیں اسی روشنی سے دیکھتے ہیں۔ ان کی زبان ایک ہی سمجھنا چاہیئے۔ مگر ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور الفاظ ذو معنین سے اتنا کام نہیں لیا۔ غرض یہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اوّلیت کا تاج رکھا گیا جس میں وقت کے محاورہ نے اپنے جواہرات خرچ کئے۔ اور مضامین کی رائج الوقت دستکاری سے مینا کاری کی۔ جب کشور وجود میں پہنچا تو ایوان مشاعرہ کے صدر میں اس کا تخت سجایا گیا۔ شہرت عام نے جو اس کے بقائے نام کا ایوان بنایا ہے۔ اس کی بلندی اور مضبوطی کو ذرا دیکھو اور جو کتابیں لکھے ہیں انہیں پڑھو۔ دنیا تین سو برس دور نکل آئی ہے۔ مگر وہ آج تک سامنے نظر آتے ہیں۔ اور صاف پڑھے جاتے ہیں۔ اس زمانہ تک اردو میں متفرق شعر ہوتے تھے ولی کی برکت نے ایسے وہ زور بخشا کہ آج ہند کی شاعری نظم فارسی سے ایک قدم پیچھے نہیں۔ تمام بحریں فارسی کی اردو میں لایا۔ شعر کو غزل اور غزل کو قافیہ ردیف سے سجایا۔ ردیف وار دیوان بنایا۔ ساتھ اس کے رباعی۔ قطعہ۔ مخمّس اور مثنوی کا رستہ بھی نکالا۔ اس کو ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر[1] کو۔ فارسی میں رودکی[2] کو۔ اور عربی میں مہلہل[3] کو۔ ولی کسی کا شاگرد نہ تھا۔ اور یہ ثبوت ہے فصیح عرب کے قول کا کہ الشعراء تلامیذ الرحمٰن اسی کو دانائے فرنگ

کہتا ہے کہ شاعر اپنی شاعری ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ایسے وقت میں کہ ہماری زبان زورِ بیان میں ایک طفلِ نو رفتار تھی۔ جو انگلی کے سہارے بغیر چل نہ سکے۔ پس جتنے قدم کہ آگے بڑھی اسی کی پرورش کے سہارے سے بڑھی۔ اردو زبان اس وقت سوائے ہندی دوہروں اور بھاشا کے مضامین کے اور کسی قابل نہ تھی۔ ولی نے اس میں فارسی ترکیبیں اور فارسی مضامین کو بھی داخل کیا۔ اس کی علمی تحصیل کا حال ہماری لاعلمی کے اندھیرے میں ہے۔ کیونکہ اس عہد کی خاندانی تعلیم اور بزرگوں کی صحبتوں میں ایک تاثیر تھی کہ تھوڑی نوشت خواند کی لیاقت بھی استعداد کا پردہ کھلنے نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ان کے اشعار سے معلوم ہوگا کہ وہ قواعد عروض کی طرح زبان عربی سے ناواقف تھے۔ پھر بھی کلام کہتا ہے کہ فارسیت کی استعداد درست تھی۔ ان کی انشاپردازی اور شاعری کی دلیل اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ ایک زبان کو دوسری زبان سے ایسا بے معلوم جوڑ لگایا ہے کہ آج تک زمانہ نے کئی پلٹے کھائے ہیں مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔ علم میں درجۂ فضیلت نہ رکھتے تھے مگر کہتے ہیں ؎

ایک دل نہیں آرزو سے خالی ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

اگرچہ ایشیا کے شاعروں کا پہلا عنصر مضمون عاشقانہ ہے مگر جس شوخی سے اخلاق کی شوخی ظاہر ہو اس کا ثبوت ان کے کلام سے نہیں ہوتا۔ بلکہ برخلاف اس کے صلاحیت اور متانت ولی کا جوہر طبعی تھا۔ ولی کا دیوان اس عہد کے شاعروں کی بولتی تصویر ہے۔ کیونکہ اگر آج دریافت کرنا چاہیں کہ اس وقت کے امرا اور شرفاء کی کیا زبان تھی؟ تو اس کی کیفیت سوا دیوان ولی کے اور کوئی نہیں بتا سکتا۔

شاعر قدرت کے دیوان میں ایک سے ایک مضمون نیا ہے۔ مگر یہ لطیفہ بھی کچھ کم نہیں کہ شاعری کا چراغ تو دکن میں روشن ہوا اور ستارے اس کے دِلّی کے افق سے طلوع ہو اکریں اس عہد کی حالت اور بھاشا کو خیال کرتا ہوں تو سوچتا رہ جاتا ہوں کہ یہ صاحب کمال زبانِ اُردو اور انشائے ہندی میں کیونکر ایک نئی صنعت کا نمونہ دے گیا۔ اور اپنے پیچھے آنے والوں کے واسطے ایک نئی سڑک کی داغ بیل ڈالتا گیا۔ کیا اسے معلوم تھا کہ اس طرح یہ سڑک ہموار ہو گی۔ اس پر دوکانیں تعمیر ہوں گی۔ لالٹینوں کی روشنی ہو گی۔ اہل سلیقہ دکاندار جواہر فروشی کریں گے اور اُردوئے معلّٰی اس کا خطاب ہو گا۔

ولی خود فقر کے خاندان عالی سے تھے اور فقیری کے دیکھنے والے بھی تھے۔ دوسرے زبان اردو کے والدین یعنی بھاشا اور فارسی بھی صوفی ہیں۔ ان جذبوں نے انہیں تصوّف شاعرانہ میں ڈالا۔ اور دل کی اُمنگ نے پیش قدمی کا تمغہ حاصل کرنے کو اس کام پہ آمادہ کیا جو سلف سے اس وقت تک کسی کو نہ سوجھا تھا۔ وہ یہی کہ فارسی کے قدم بقدم چلیں اور پورا دیوان مرتب کریں۔

غرض جب دیوان ولی دِلّی میں پہنچا تو اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا قدر دانی نے غور کی آنکھوں سے دیکھا۔ لذت نے زبان سے پڑھا۔ گیت موقوف ہو گئے۔ قوال معرفت کی محفلوں میں اس کی غزلیں گانے بجانے لگے۔ ارباب نشاط احباب کو سنانے لگے۔ جو طبیعت موزوں رکھتے تھے انہیں دیوان بنانے کا شوق ہوا۔"

پس ولی نے اس اندھیری دنیا میں اپنی شاعری سے اُجالا پھیلا دیا۔ اس نے

جدید اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ اس نے اس فن کو اپنے پرتو سے رونق بخشی۔ اردو شاعری کو فارسی شاعری کے ڈھنگ پر لانے کے لئے رہنما ہو گیا۔ گو اس کے نقشِ آنے والے ہجوم خلائق کے پیروں نے مٹا کر رکھ دیئے مگر اس نے اپنا نقش نظم اردو کی تواریخ کے صفحوں پر ایسا جما دیا ہے کہ قیامت تک اس کا حقِ استادی کسی طرح باطل نہیں ہو سکتا۔ گو اُس وقت زبان ریختہ شستہ اور صاف نہیں ہونے پائی تھی۔ بندش کی چستی۔ ترکیب کی درستی لفظوں کا دروبست کم تھا۔ اور نہ خیالات میں آج کل کی سی نزاکت تھی۔ اور نہ تشبیہ و استعارے تھے۔ اور نہ فارسی محاوروں کا زور حاصل تھا اس لئے متعدد الفاظ بھاشا اور گجراتی وغیرہ کے ایسے تھے کہ اب سننے میں بھی نہیں آتے۔

ولی ناصر علی اور بیدل کا معاصر تھا جو مضمون بندی اور خیال آفرینی میں بال کی کھال نکالتے تھے۔ ولی ان لوگوں سے راہ و رسم رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ فارسی شاعری کا بھی ماہر تھا تاہم اردو میں شاعری شروع کی تو اس کا یہ انداز ہے ؎

جسے عشق کا زخم کاری لگے ہے اُسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے ہے

شاعری کا یہ وصف قدما کے اخیر دور تک قائم رہا۔ لیکن مدارج میں فرق آتا گیا۔ کیونکہ جس قدر زمانہ گذرتا جاتا تھا سادگی کے بجائے زور اور تکلف آتا جاتا تھا۔ لیکن دو سو برس آگے کی شاعری میں یہ حسن و خوبی، سلاست و تخیل آفرینی کا رنگ واقعی تعجب خیز ہے جبکہ اردو زبان اپنے گہوارہ میں جھول رہی تھی۔ گویا کسی کا یہ شعر ایسے موقع پر برمحل ثابت ہو سکتا ہے ؎

گرچہ قندیل سخن کو منڈھ لیا تو کیا ہوا ڈھانچے میں تو ہیں وہی اگلی برس کی تیلیاں

یوں تو ولی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ اور تقریباً ہر صنف میں اس کے

ان شاعری کا زور عیاں ہے۔ کلیاتِ ولی کے مطالعہ سے اس کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے۔
ن فنِ غزل گوئی ولی کے کلام کی روح رواں ہے۔ اور یہی وہ صنف ہے جس کی طرف اس کے
روؤں نے کم توجہ کی ہے۔ ولی بحرِ غزل گوئی کا ناخدا ہے یہ تائے سخن کا مردِ میدان ہے میر
اشاعر جو بعد میں "سرتاج الشعرا" کہلائے ولی کے نقشِ قدم پر چلے اور اس لقب کا مستحق قرار پائے
ع کا قول ہے جو میر کا معتقد نہیں وہ گویا اپنے آپ سے بے بہرہ ہے لیکن ولی کے منکر تو
شیطان گردانے جاتے ہیں۔

ولی کی شاعری کے خالص ہندی تخیل نے اس کو تمام اردو شعرا سے ممتاز کر دیا ہے
نکہ یہ پاکیزہ ہندی رنگ بعد کے شعرا میں کہیں نہیں پایا جاتا۔ عموماً اس کی شاعری میں ایرانی
نک نمایاں ہے۔ ولی کا ساوالہانہ اندازِ بیان، کلام کی روانی اور موزونی، برجستگی، بندش کا یہ عالم
بقول کسے ؎

قافیے پاؤں پہ گرتے ہیں کہ باندھو ہم کو!

لفظی موشگافیاں، محاکاتِ شاعری، تشبیہوں اور استعاروں کی دلاویز جھلکیاں، الفاظ کی
ینی اور موسیقی، صنائع بدائع کا برجستہ استعمال، غرض کونسی چیز شاعرانہ نقطۂ نظر سے اس کی شاعری میں نہیں
شعر میں لطیف جذبات ہوں، شعر حسنِ بیان کا مرقع ہو تو وہ صرف شعر ہی نہیں بلکہ سحر ہے
دو ہے طلسم ہے۔ اور اگر اسی شعر میں وا ہیات، عامیانہ لچر خیالات ہوں صرف صنائع کا انبار
نکر ہو تو وہ محض خرافات ہے۔ جس طرح نقاش کے لئے رنگ اور مغنی کے لئے ساز کی خوبی لازمی
ہے اسی طرح شاعر کے لئے زبان اور اسلوب مسالہ کا کام دیتے ہیں۔ اور شاعری کی فنکاری انہیں پر منحصر ہے

ایک قوم جب ابتدائی حالت میں ہوتی ہے تو اس کا تمدن سادہ ہوتا ہے لیکن عملی زندگی اس میں زیادہ ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ تصنعات کو دخل ہوتا جاتا ہے۔ زیبائش و آرائش لطافت و نزاکت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ اسی طرح شاعری اپنے ابتدائی عہد میں سادہ ہوتی تھی۔ شعراء اپنے خیالات کو سادہ اور عام فہم زبان میں ادا کرتے تھے۔ پھر بتدریج استعارات میں رنگینی اور تشبیہات میں نزاکت پیدا ہوتی جاتی ہے۔ مبالغے آسمان کی خبر لاتے ہیں۔ بال کی کھال نکالی جاتی ہے۔ محسوسات سے گذر کر صرف خیالی چیزوں پر دار و مدار رہتا ہے۔ اور یہ ترقی کی آخری منزل ہے۔ جو تنزل کی حدود سے جا ملتی ہے۔ اصول ارتقا کے مطابق شاعری کا قدم بھی میدان ترقی میں بڑھتا رہا۔ حتیٰ کہ تیمور کے حملوں نے ملک کو تہہ و بالا کر دیا۔ اور خواجہ حافظ کے بعد شاعری کی ترقی ایک دم رُک گئی۔ اس کے بعد سلاطین صفویہ کا دور شروع ہوا تو شاعری کا چشمہ پھر اُبل پڑا اسی دور میں ولی سا سخنور پیدا ہوا جس نے غزل گوئی کے نغمہ کو اس زور سے چھیڑا کہ زمین سے آسمان تک گونج اٹھے۔ اس نے زبان کو صنعتوں سے اس طرح آراستہ کیا کہ زبان مالا مال ہوگئی۔ ولی کی شاعری نے زبان کو زندۂ جاوید بنا دیا۔ اور اسی کے ہاتھوں فارسی نے اپنا آخری سانس اردو کے جنم میں لیا۔

شعر کی کائنات صرف دو مصرعوں پر ہے اور ان دو مصرعوں کو مئے دو آتشہ بنا دینا شاعر ہی کا کام ہے۔ مولانا حالی کہتے ہیں "غزل میں جب تک سوز و گداز نہ ہو بچہ جب تک ابھو نچال اور چلبلا نہ ہو دونوں میں کشش اور گیرائی نہیں ہوتی"۔

ولی نے اس کلیہ کو ثابت کر دیا کہ دنیا واقعات کی ایک جولانگاہ ہے۔ یہاں کی نت نئی رنگینیاں خود شاعر کے قلب میں نئے نئے خیالات کا ہیجان بپا کرتی ہیں۔ شاعر کے تخیلات محدود نہیں ہیں

شعر میں جب تک تلون و تنوع نہ ہو شعر مقبول نہیں ہوتا۔ شاعر ایک ہی مضمون کو مختلف پیرایہ میں باندھ سکتا ہے مثلاً مولانا حالی کا یہ خیال کسی مشہور شاعر کا دیوان دیکھ کر کہ اس نے صرف مضمون "چاک گریباں" کو تیئیس[۲۳] طریقوں سے باندھا ہے۔کیسا معجزہ ہے قدرت زبان کا۔

محاکات کا ایک زبردست آلہ تشبیہ ہے اکثر اوقات ایک چیز کی اصلی تصویر جس طرح تشبیہ سے دکھائی جا سکتی ہے دوسرے طریقہ سے ادا نہیں ہو سکتی تشبیہ و استعارے کی صنعتوں نے شاعری کی دنیا میں ایک دھوم مچا دی ہے۔شاعری کا حسن ان سے دوبالا ہو جاتا ہے جب کسی نہایت نازک اور لطیف چیز یا حالت کا بیان کرنا ہوتا ہے تو الفاظ اور عبارت کام نہیں دیتی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ کی سنگینی نے اگر اُن کو چھو لیا تو انہیں ٹھیس لگ جائے گی۔ان کی نزاکت ان صدمات کی متحمل نہ ہوگی جس طرح حباب ذرا سے مس سے ٹوٹ جاتا ہے۔ایسی ہی موقعوں پر شاعر کو تشبیہ سے کام لینا پڑتا ہے وہ اسی قسم کی نازک اور حسین صورت کو ڈھونڈھ کر پیدا کرتا ہے اور شعر میں ایک قیامت کا حسن بھر دیتا ہے تشبیہ ایک ایسی عام صنعت ہے کہ تقریباً ہر شاعر اس سے کام لیتا ہے اس لئے جب تک تشبیہ میں کوئی ندرت اور خاص خوبی نہ ہو کوئی اثر پیدا نہیں کر سکتی۔

ہر تشبیہ ابتدا میں نادر و پُر لطف ہوتی ہے لیکن بار بار کے استعمال سے اس کی تازگی اور ندرت جاتی رہتی ہے۔اس کی رونق میں دھندلا پن نمایاں ہونے لگتا ہے۔اور وہ رفتہ رفتہ کثرت استعمال سے بے اثر ہو جاتی ہے۔اس لئے شاعر کیلئے اپنے کلام کو ہر دلعزیز اور دلنشین بنانے کے لئے یہ لازمی ٹھہرا کہ وہ اُن میں جدّت و ندرت پیدا کرے۔نئی نئی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر لائے۔بڑے بڑے شعرا کا معراج کمال یہی ہے۔اور تھا۔اُن کے کلام میں اچھوتی تشبیہیں اور نئے نئے استعارے پائے جاتے ہیں۔ولی تشبیہات کا پیغمبر ہے۔

اس نے تشبیہ اور استعارے کی صنعتوں کو وہ فروغ دیا کہ متاخرین سخن نے اسی کی شمعِ فروزاں سے اکتسابِ نور کیا ہے۔

ولی کے زمانہ میں شعراء صنعتِ ایہام کو شعر کی روح رواں سمجھتے تھے۔ اس کا استعمال استادی کی دلیل تھی لیکن ولی نے اس صنعت سے بہت گریز کیا۔ گویا اس نے یہ محسوس کر لیا کہ اس سے سوائے معنوی پیچیدگی کے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کی جدت پسند طبیعت نے اس صنعت کو پسند نہیں کیا۔ زیادہ تر اس کے کلام کا زیور تشبیہات اور استعارے ہیں جن کو نئی نئی قسم سے باندھ کر ہر شعر بوع "نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" کی بولتی تصویر بنا دیا ہے۔ ولی صنائع کا صنعت گر ہے اس کی صنعتیں بعض وقت وجد آفرین نزاکت اختیار کر لیتی ہیں۔ وہ اس حسن و خوبی سے تشبیہ دیتا ہے گویا حسن و تخیل کا نقشہ کھینچ رہا ہے ولی کے کلام میں تشبیہ کی ایک دنیا ہے۔

فطرت انسانی بھی عجیب طرح کی واقع ہوئی ہے کہ واقعات سے زیادہ محاکات میں اسے مزہ آتا ہے تماشا گاہوں میں اداکاروں کے مصنوعی حرکات و سکنات اصل سے زیادہ اس کا دل لبھاتے ہیں۔ یہی حالت تشبیہ کی ہے کہ وہ بھی ایک قسم کی تصویر ہے جس سے مشبہ کا اثر بڑھ جاتا ہے۔ تشبیہ کے معنی ہیں کسی خاص لحاظ سے ایک شئے کو کسی دوسری شئے جیسا ظاہر کرنا۔ خواہ اس چیز کا ذکر کیا جائے کہ نہیں۔ جس چیز کو تشبیہ دیں گے وہ "مشبہ" کہلائے گی۔ جس کے ساتھ تشبیہ دیں گے وہ "مشبہ بہٖ" کہلائے گی۔ اور مشبہ و مشبہ بہ کا نام "طرفین تشبیہ" ہوگا۔ جس صفت میں شریک قرار دیا جائے اس کو "وجہ شبہ" کہیں گے۔ جو حرف تشبیہ پر دلالت کرے گا اسے حرف تشبیہ کہیں گے۔ یہ چاروں مل کر ارکانِ تشبیہ کہے جاتے ہیں۔

تشبیہ کے لئے ضروری ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ ایک جنس کے نہ ہوں۔ بلکہ ایک اعتبار سے ہم شریک اور دوسرے اعتبار سے جدا جدا ہوں۔ چنانچہ ارکان تشبیہ پانچ ہیں:۔ مشبہ، مشبہ بہ، وجہ شبہ، حرف تشبیہ، غرض تشبیہ ——

مشبہ وہ ہے جسے ایک چیز سے جو اس سے صفت میں زیادہ ہو تشبیہ دیں۔ اس میں ج و ذم کی قید نہیں۔ "مشبہ بہ" وہ ہے جو صفت میں مشبہ سے بڑھکر ہو اور اس کی قدر بڑھا دے۔ وجہ شبہ" وہ ہے جس کا ذکر کیا جائے۔ حرف "تشبیہ" وہ ہے جو تشبیہ پر دلالت کرے۔

غرض تشبیہ، جس کے لئے ایک چیز کی دوسری چیز سے تشبیہ دی جائے۔ فلاں کا چہرہ روشنی میں مانند آفتاب کے ہے۔ اس میں۔ چہرہ مشبہ، آفتاب مشبہ بہ، روشنی وجہ شبہ، مانند حرف تشبیہ، ترقی معشوق (جو مذکور نہیں) غرض تشبیہ ہے۔ تشبیہ کی ایک بے مثل نظیر ملاحظہ ہو ؎

پڑا جو سایۂ کاکل تو ڈر کے ساقی نے ۔۔۔ یہ کہہ کے رکھ دیا ساغر کہ "ہیں تہ لب میں سانپ"

سخ کہتے ہیں ۔۔۔ ذقن یار میں کی خط نے رسائی پیدا ۔۔۔ چاہِ یوسف میں خضر بہرِ تماشا اترا

ادر کی تشبیہ سنیئے ۔۔۔ بڑھ چلا رُخ سے یہ اُن کے خطِ اخضر کیسا ۔۔۔ پرِ طاؤس ہے قرآن سے باہر کیسا

الی کہتے ہیں ۔۔۔ مت مردمک دیدہ میں سمجھو یہ نگاہیں ۔۔۔ ہیں جمع سویدائے دل چشم میں آہیں

اداب کا خیال ۔۔۔ قریب رُخ کے جو وہ زلف پُر شکن دیکھی ۔۔۔ حلب کی صبح شبِ وادیٔ یمن دیکھی

ابر ۔۔۔ زلف جاناں ہو اگر سایہ فگن پانی میں ۔۔۔ نظر آنے لگے سنبل کا چمن پانی میں

فیس ۔۔۔ تشبیہ دے چکا ہوں میں مار دو سر سے تھا ۔۔۔ زلفوں کو اس کی لہر لگا تا ہوں ڈر کے تھا

تش ۔۔۔ چھپتے ہیں گیسوئے مشکیں جو اس رخسار روشن پر ۔۔۔ بغل میں ظلمت شب نے لیا ہے نور کا تڑکا

ظفر — ہے عشق کا دریا دل پرسوز میں پنہاں / حیراں ہوں کہ ہے آتش سوزاں کے تلے آب

شائق — زلف تیری تا کمر پہنچی نہ پھر آگے بڑھی! / سورۂ واللیل کی تفسیر آدھی رہ گئی

سکندر — گرا ہے مانگ میں دل میرا آہ ڈھونڈوں کدھر / کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات ادھر

وزیر — اپنی ہستی میں تو آثار فنا سارے ہیں / شام کو ذرے ہیں اور صبح کو ہم تارے ہیں

گویا — روتا ہوں میرے ساتھ ذرا ہنستے رہو تم! / بجلی بھی چمکتی رہے باراں کے برابر

حسرت — بدن کو جان کو دل کو جگر کو آگ لگی! / غم فراق مرے گھر کے گھر کو آگ لگی!

آتش — سرمہ منظور نظر ٹھیرا ہے چشم یار کو / نیلگوں گنبد اٹھایا مردم بیمار کو

حسام — ہندوئے زلف کی صحبت ہے انھیں آٹھ پہر / نہیں معلوم کہ کیسے ہیں مسلماں عارض

سلام — حدیث زلف چشم یار سے پوچھ! / درازی رات کی بیمار سے پوچھ

شکر — دیکھ تو اے چشم سیل اشک طغیانی میں ہے / گھر سنبھال اپنا کہ دیوار مژہ پانی میں ہے

امانت — فلک یہ تو ہی بتا دے کہ حسن و خوبی میں / زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

مومن — تا نہ پڑے خلل کبھی آپ کے خواب ناز میں / ہم نہیں چاہتے کمی اپنی شب دراز میں

یا پھر مومن ہی کی کافر بیانی ؎ نجاؤں گا کبھی جنت میں میں نجاؤں گا / اگر نہ ہوئے گا نقشہ تمہارے گھر کا سا

واقف لبوانی ؎ خرامِ ناز بتا دے کدھر وہ جائیں گے / چمن میں آئے کہ دل میں کہاں بہار آئے

سراج اورنگ آبادی ؎ نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے ادا کرو / کہ شراب حسرت و آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

احسن — حشر سے پہلے نہ ہو مشق خرام ناز ختم / جتنے گھر آباد ملتے جائیں ویراں کیجئے

فانی — آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں / جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

جگر	یوں تو کیا کیا نظر نہیں آتا !	کوئی تجھ سا نظر نہیں آتا !
سیماب	اڑائے برق و گل ولالہ نے بہت خاکے	مگر کوئی مرے دل کا جواب ہو نہ سکا
کسی کا فارسی شعر ہے	وفا آموختی آز ما بکار دیگراں کردی	ربودی گوہری از ما نثار دیگراں کردی
اکبر (الٰہ آبادی)	حباب اپنی خودی سے بس یہی کہتا ہوا گذرا	تماشہ تھا ہوا نے اک گرہ دیدی تھی پانی میں
امیر مینائی	اٹھائے صدمے پہ صدمے تو آبرو پائی	امیر ٹوٹ کے دل گوہر یگانہ ہوا !
جوش (ملیح آبادی)	یہ تو دستور ہو گیا ہے کہ جوش کچھ رات بھیگتے ہی	دہکنے لگتی ہے سوز دل سے اک آگ سی میرے تن بدن میں
اقبال	میں نے پایا ہے اسے اشک سحر گاہی میں	جس دُر ناب سے خالی ہے صدف کی آغوش
چکبست	فنا کا ہوش آنا زندگی کا درد سر جانا	اجل کیا ہے خمار بادۂ ہستی اُتر جانا
غالب	ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب	میں نے دشت امکاں کو ایک نقش پا پایا
دبیر	یہ رُخ ہے کہ آئینۂ طاق دل زہرا (رض)	حسن اپنا انھیں آئینوں میں شرع نے دیکھا
انیس	یوں برچھیاں تھیں چار طرف اس جناب کے	جیسے کرن نکلتی ہے گرد آفتاب کے
زیب النسا	دُرابلق کسی کم دیدہ موجود	مگر اشک بتان سرمہ آلود

یہ تو متاخرین کا کلام رہا۔

اب ولی کے یہاں تشبیہ کے ہنگامے دیکھئے۔ ایسے دور میں جب کہ "گیسوئے اردو" ابھی بلا کی الجھنیں پڑی تھیں۔ دست مشاطہ کو "اندیشہ ہائے دور دراز" نے پراگندہ کر دیا تھا۔ ایسے اشعار کا معرض وجود میں آنا معجزہ سے کم نہ تھا ؂

مند گل منزل شبنم ہوئی ‏ ‏ ‏ دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

کتنا انوکھا طرزِ بیان ہے۔ پھول کی کھلی ہوئی پنکھڑی کو "دیدۂ بیدار" سے تشبیہ دینا! احساسات کی دنیا میں ایسے لطیف کنایہ بیداری کی روح پھونک دیتے ہیں۔ اس قسم کے خیالات سے شاعر دنیا میں ایک آگ لگا سکتا ہے شاعری شاعر کے کیفیاتِ قلب کا آئینہ ہے ؎

مجھ نین کے یعقوب کی نظارہ بازی پیر تھی یوسف کے دیکھے سوں جواں پھر آج نظارہ ہوا

گویا غالب کی زبان میں اس تخیل کو یوں سنیئے ؎

ان کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے

یعقوب کی آنکھیں جو یوسف کے انتظار میں سفید ہوگئی تھیں اُن کو عالمِ پیری سے تشبیہ دی ہے اور یوسف کو دیکھ کر جو رونق آتی ہے اس حسن اتفاق سے از سرِ نو جوان ہو جانا قیامت کا کنایہ ہے غالب نے تھوڑے بہت تصرف کے بعد اس تخیل کو اس طرح باندھا ہے ؎

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

روے زمیں کا خال ہے زینت سیں اے صنم تیرا جو مثلِ نقشِ قدم پائمال ہے

محبوب کے نقشِ قدم کو روئے زمین کے خال سے تشبیہ دینا ندرتِ تخیل کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ ولی کے یہاں عام اور پامال تشبیہیں نہیں ہیں۔ اس کی تشبیہوں میں کیفِ حسن، اور دلآویزی پائی جاتی ہے۔ اسی قبیل کا ایک شعر ہے ؎

ہم نے جانا تھا کفِ پا میں تمہارے خال ہے لیکن اب دیکھا سویدائے دل پامال ہے

ولی کے محبوب کا نقشِ قدم روئے زمین کی زینت خال بن کر دوبالا کر رہا ہے۔ لیکن ذوق کا تخیل اس خال کو کسی اور ہی پہلو سے تراشا ہے۔ ذوق اس کو اپنے برباد شدہ دل کے

سودا اسے تشبیہ دیتے ہیں ؎

یہ سیہ زلف تجھ زنخدان پر
ناگنی جیوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

تشبیہ میں عمومیت کے ساتھ ایک ندرت ہے ؎

وَلی اس گوہر کان حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

صنعت تشبیہ کی کتنی حسین ترکیب ہے۔ خیال کی جدت قابل آفریں ہے۔ دل ایک گنجینۂ راز ہے۔ جہاں دنیا کے کہن کی بڑی اہم ترین داستانیں دُر یکتوں کی طرح پوشیدہ ہیں۔ وَلی کا باحیا معشوق اس کے گھر اس طرح آتا ہے جس طرح کسی کے دل میں راز آجاتا ہے اور دوسرے کے کانوں کان خبر نہیں ہوتی

تجھ روپ کے گلزار سوں تن من مرا گلشن ہوا
میرے نین میں تو سجن جیسے چندر در حوت ہے

عالم فلکی کے "قمر در عقرب" والے تخیّل کو تشبیہ کی رنگینی سے کیسے آراستہ کیا ہے ؎

تو سر سے قدم تلک جھلک میں
گویا ہے قصیدہ انوری کا

کیسی نادر اور انوکھی تشبیہ ہے۔ اپنے معشوق کا سراپا کس حسن وخوبی سے کھینچا ہے کہ تخیّل کی دنیا میں ایک ہلچل ہے۔ وَلی کے یہاں زلف وخال کی تشبیہوں کا ایک دریا ہے۔ ہر تشبیہ اپنے ندرت تخیل کی وجہ سے اپنا جواب نہیں رکھتی ؎

تری یہ زلف ہے شام غریباں
جبیں تیری مجھے صبح وطن ہے

وَلی کا تخیّل حسن باطنی ولطافت معنوی سے کیسا مالا مال ہے۔ غربت کی شام کو زلف سے تشبیہ دینا اور روئے محبوب کو صبح وطن سے ملانا کیسا اچھوتا طرز ہے۔ شاعر اپنے اطراف ایک دنیا رکھتا ہے جس دنیا میں وہ جیتا ہے اور سانس لیتا ہے۔ اس کے تخیّل کی دنیا سب سے الگ اور انوکھی ہے۔

کبھی اپنے خیالات کو ایسے شعر میں ڈھالتا ہے جو سحر بنگالہ بن کر دلوں کو مسخر کر لیتا ہے۔ کبھی ایک تلوار، ایک تیر ایک برچھی بنا کر دلوں میں پیوست کر دیتا ہے۔ جو دلوں کو چھید کر رکھ دیتا ہے۔ اس سے دل کی ساری کائنات تہ و بالا ہو جاتی ہے۔ نظام عصبی میں ایک اچھا شعر سنسنی سی ڈال دیتا ہے۔ اور انسان پہر دل سر دھنتا رہجاتا ہے ؎

بس کہ رویا ہوں یاد کر کے تجھے　　چشم میری ہے دامنِ گلچیں

روتے روتے جب جگر کا پانی سوکھ گیا تو اس کی جگہ خونِ دل نے لے لی۔ اب آنسوؤں میں خون مل کر آنسوؤں کے قطرے "دُرابلق" بن گئے۔ دامن پر جب یہ آنسو گرنے لگے تو بعینہٖ اپنا بھی دامن دامنِ گلچیں ہو گیا جس نے صبح صبح آکر باغ سے پھول چنے ہیں کیسی رنگین و تباہ کن تشبیہ ہے اسی تخیل کو کسی کی زبان میں یوں سنئے ؎

پلکوں پہ میرے اشک بھی ہیں خونِ جگر بھی　　اِن کانٹوں میں یاقوت بھی ٹنکتے ہیں گہر بھی

اِسی قبیل کا ایک اور شعر نواب معین اللہ ولہ بہادر کا ہے ؎

آتشِ سوزِ نہاں اور بھڑک تھوڑی دیر　　نوکِ مژگاں پہ ابھی لختِ جگر کچے ہیں

حسرت کی حسرت بھری داستان سنئے ؎

لختِ دل گرنے لگے اب اشکِ گلگوں ہو چکا　　رحم اے آنکھو کہ جتنا تن میں تھا خوں ہو چکا

میر کا اندازِ بیان دیکھئے ؎

دل پرخوں کی اک گلابی سے　　عمر بھر ہم رہے شرابی سے

ان مثالوں سے موازنہ مقصود نہیں۔ کیونکہ آج کی زبان اور خیالات میں بہ نسبت اُس

زمانہ کے بہت وسعت ہوگئی ہے لیکن ایسے دور میں ایسے کلام کا نکلنا ایک جادو سے کم نہیں جب کہ اُردو زبان پر ابھی دودھ کا مزہ باقی تھا۔ وہی زبان اب دنیا کا مزہ چکھ کر قیامت برپا کر رہی ہے ؎

تجھ لب و زلف کے تماشے کوں چل کے آئے ہیں مصری و شامی

لب کی مناسبت سے مصری کی مشابہت اور زلف کے دیکھنے کو شامیوں کا آنا کیسا پُر کیف و دقیق تخیل ہے۔ لب کی شیرینی کا شہرہ سن کر مصر سے مصریوں نے یورش کی ہے کہ دیکھیں وہ کیسے لب ہیں جن کی شیرینی کا یہ چرچا ہے۔ زلف نے جو دن دھاڑے اندھیرا کر دیا ہے اس کی شہرت نے شامیوں کے دل اشتیاق سے بھر دیے ہیں۔ ولی تشبیہات کا بادشاہ نہیں تو کیا ہے جس کا دیوان ایسے ہنگاموں سے مالا مال ہے۔

اب جاڑوں کی طویل اور نہیں ختم ہونے والی راتوں کی زلف سے تشبیہ ملاحظہ ہو ؎

تری زلفاں کی طولانی کوں دیکھے مجھے لیل زمستاں یاد آئے
جو کُئی دیکھے مری انکھیاں کوں روتے اُسے ابر بہاراں یاد آوے

اس خیال کو متاخرین نے ذرا سی ترمیم کے بعد یوں باندھا ہے ؎

یہ کہہ دو ابر باراں سے اگر برسے تو یوں برسے کہ جیسے مینہ برستا ہے ہمارے دیدۂ تر سے

لب ہیں ترے فی الحقیقت چشمۂ آب حیات خضر خط نے اس سوں پایا ہے سراغ زندگی

لب کی آب حیات سے تشبیہ، خط سبز کو اس آب حیات کے چشمہ کا راستہ کہنا جس سے زندگی کا پتہ چلتا ہے۔ ایک اور شعر اسی غزل کا ہے ؎

بے عزیزاں سیر گلشن ہے گل داغ الم جنت احباب ہے معنی میں باغ زندگی

بغیر اپنوں کے گلشن کی سیر کرنا گویا گل داغ الم پانا ہے۔ احباب کی صحبت ایک جنت ہے اور دراصل یہی زندگی کا باغ ہے، چمن ہے، گلشن ہے۔ اس میں صنعت مراعاۃ النظیر بھی ہے۔ گلشن، گل، جنت، باغ سب ایک ہی قبیل کی چیزیں ہیں۔ اسی قبیل کا یہ شعر ہے ؎

پائے در زنجیر پیشِ دوستاں به که با بیگانگاں در بوستاں

شاعری کے رمز دیکھئے ؎

غنچے کوں گل کے حال ہیں آنا محال ہے تیرے دہن کی بات کہوں گر چمن گے

یعنی اگر تیری غنچہ دہنی کا حال غنچہ سے کہہ دوں تو اس کے لئے پھول بننا مشکل ہو جائے وہ وہیں مرجھا کر رہ جائے۔ پھول کی شکل تو غنچہ کی اس وقت ہوتی ہے جب وہ خوشی سے کھل کھلا کر ہنس دیتا ہے۔ اس کا اولین قہقہہ اس کو پھول بنا کر چمن کی زینت دوبالا کر دیتا ہے۔ نسیم سحر اس کی خوشبو چو طرف منتشر کرتی پھرتی ہے۔ بلبلوں میں چہ میگوئیاں ہونے لگتی ہیں۔ اور ایک گل سے دوسرے گل تک یہ خبر پہنچ جاتی ہے کہ آج فلاں غنچہ پہ بہار آئی ہے۔ اس نے پھول کا جنم لیا ہے۔

پھر ولی کی زلف کی داستان سنیئے ؎

جس وقت سر کرو گے بیاں اس کے زلف کا سودا زدوں پہ غم کے سیہ روز لاؤ گے

چشم رکھتا ہوں اے سجن کہ پڑھوں تجھ نگہ سوں قصیدۂ جامی!

اس میں رعایت لفظی اور تشبیہ کی مناسبت کا کتنا اچھوتا تخیل ہے۔ آنکھوں کو جام مئے سے تشبیہ دینا اب ایک قصۂ پارینہ ہو گیا ہے لیکن "اب" کا دورِ شاعری اسی جام کی شراب کہن کا

بادہ خوار ہے ولی ہی کا تخیل ہے جس سے خوشہ چینی کی ہے۔ کسی گمراہ بستی کا سراغ خار دار جھاڑیوں میں سے گذر کر لگانا کمال ہے۔ پڑے ہوئے راستہ پر سے گزر کر منزلِ مقصود پر پہنچ جانا ایسا کچھ کمال نہیں

ولی کہتا ہے میری آنکھیں اس لئے بنی ہیں کہ میں تیری نگاہ سے جامی کا قصیدہ پڑھوں

اس شعر میں کئی صنعتیں نہاں ہیں۔ صنعت ایہام بھی ہے۔ جامی میں جام کے بھی معنی مضمر ہیں جن کو آنکھوں سے تشبیہ دی ہے اور جامی کا قصیدہ بھی مراد ہے۔ اسی تخیل کو کئی رنگ میں دیکھیے ؎

کیفیتِ چشم اس کی مجھے یاد ہے سودا ساغر کو مرے ہاتھ سے لینا کہ چلا میں

میری ان نیم باز آنکھوں میں ساری مستی شراب کی سی ہے

ساغر کو ذرا سنبھال لینا میں نشہ میں چور رسا قیا ہوں (نیاض)

ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کبھی پایا اور پھر بزم میں سب نے اسے چلتے دیکھا

شاعر نظامِ عصبی کی رگ رگ پر چھا دیتا ہے۔ احساسات کا نباض اس سے زبردست شاید ہی کوئی ہو سکے ایسا شعر جو ان میں ایک کیف و سرور پیدا کر دے شعر نہیں سحر ہے ؎

پتلی میں میرے نین کے بستا ہے دلبر عین لیا پردے منیں ظلمات کے جیوں چشمۂ حیواں سے

آنکھ کی پتلی کو ظلمات سے تشبیہ دی ہے اور محبوب کے قیام گاہ کو چشمۂ حیواں سے کتنا لطیف کنایہ ہے کیسی حیران کن تشبیہ ہے۔ تخیل کی نزاکت اور اپج قابلِ تحسین ہے جس طرح زمین بے روئیدگی کے ایک بنجر ویرانہ ہے اسی طرح زبان بے شاعری کے ایک پھیکا اور بے رونق سا سودا۔ اسی زبان کی دلہن کے لئے تشبیہ و استعارہ کی صنعتیں زیور جیسی ہیں۔ شاعری میں صنائع لفظی و معنوی مفقود ہوں تو اس کی آدھی جان جاتی رہی۔ ہر مکان کسی جلسہ کے انتظام پر درہم و برہم معلوم

ہوتا ہے۔ مگر ولی نے پیرہنِ سخن کو اس طرح آراستہ کیا ہے کہ جو اس کے بعد آئیں گے وہ آرائش و زیبائش کے انداز سوچ سوچ کر پیدا کریں گے۔ یہ داغ بیل تو اسی کی ڈالی ہوئی ہے جو اس چار دیواری کا اوّلین معمار تھا۔

اس تخیل کی معنی آفرینی دیکھئے ؎

توجب نہانے کو جاوے روز روشن جان دریا ‏ ‏ ‏ تری زلفاں کے ہندو کی سیاہی تا زحل جاوے

معشوق کو "روز روشن" سے تشبیہ دی ہے۔ ہندوئے زلف سے زلف کی سیاہی مراد ہے اور زحل عرض سماوی کا منحوس ستارہ ہے۔ ولی کہتا ہے کہ توجب اپنا درخشاں چہرہ لے کر دریا کی طرف نہانے کے لئے جاوے تو خدا کرے تیری زلف کی سیاہی جانبِ زحل صعود کرے۔ شعر میں رعایت لفظی کی صنعت بھی ہے اور تشبیہ کا تو مرقع ہے۔ اسی تخیل کو انیس سے سنئے ؎

مثالِ ماہیٔ بے آب موج تڑپا کی ‏ ‏ ‏ حباب پھوٹ کے روئے جو تم نہا کے چلے

کسی اور شاعر نے اس نقطۂ خیال کو ذرا سی الٹ پھیر کے بعد یوں نظم کیا ہے ؎

تم نہا کر جو چلے غم سے سمٹ کر دریا ‏ ‏ ‏ رہ گیا دیدۂ گرداب میں پانی ہو کر

ولی ‏ ‏ ہوا معلوم تجھ زلفاں سوں اے شوخ ‏ ‏ ‏ کہ شاہِ حسن پر ظلِ ہما ہے!

سایہ میں سیاہی ہوتی ہے۔ اور ہما کا جس کے سر پر اتفاق سے سایہ پڑ جائے سنتے ہیں کہ وہ بادشاہ ہو جاتا ہے ولی نے معشوق کی زلف کو ہما کے سایہ سے تشبیہ دی ہے اور اس کو شاہِ حسن بنایا ہے۔ تخیل میں بلا کی ندرت ہے۔ شاد آبا نے اسی تخیل سے خوشہ چینی کی ہے۔ ان کا شعر ہے ؎

کہیں کیونکر نہ شاہِ حسن تم کو ‏ ‏ ‏ مشابہ زلف ہے بالِ ہما سے

وَلی زلف کا سایہ اور تخیل ؎

سنبل اس کی نظر میں جا نہ کرے جس کو تجھ گیسوؤں کا سودا ہے!

تشبیہ و مراعات النظیر کی ہنگامہ خیزی اس شعر میں دیکھئے ؎

سُرج ہے شعلہ تری اگن کا جو جا فلک پر جھلک لیا ہے نمک نے اپنے نمک کوں کھو کر نمک سوں تیرے نمک لیا ہے

سورج تیرے حسن کا ایک شعلہ ہے جو فلک پر اپنی جھلک دکھاتا ہے۔ نمک میں جو نمکینی پائی جاتی ہے وہ تیرے حسن کی نمکینی سے ماخوذ ہے۔ نمک نے اپنی نمکینی کو کھو کر تیرے حسن کی ملاحت سے نمک حاصل کیا ہے۔ پہلے نمک کے معنی تو نمک ہی کے ہیں۔ دوسری تیسری مرتبہ جو نمک کا لفظ ہے اس کے معنی ملاحت کے ہیں حسن میں اگر نمک اور ملاحت نہ ہو تو وہ پھیکا کہلاتا ہے۔ لہٰذا اگر نمک تجھ سے نمکینی یا ملاحت نہ لیتا تو اس میں پھیکا پن ہوتا۔ سرج اور شعلہ اگن یہ سب ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ ان میں تشبیہ بھی ہے اور مراعاۃ النظیر بھی ہے۔

انھیں دونوں صنعتوں کو وَلی کے یہاں دوسرے انداز پر یوں سنئے ؎

تجھ نین کے عصر میں بے وقر ہے شراب مے خانہ تجھ نگاہ سوں دائم خراب ہے

اسی تخیل کو کسی نے کچھ تصرف کر کے یوں باندھا ہے ؎

جام مے توبہ شکن توبہ مری جام شکن سامنے ڈھیر ہے ٹوٹے ہوئے پیمانوں کا

وَلی کے تخیل کا انداز انوکھا ہے۔ یہ زمانہ جب کہ تیری آنکھیں ایک عالم کو مخمور کر رہی ہیں خرابات کے لئے تباہی کا دور ہے شراب میں وہ کیف و سرور باقی نہ رہا جس نے تیری نگاہوں کو ایک بار دیکھ لیا اس کو شراب کی حاجت نہیں رہی۔ ملٹن کہتا ہے ایک شاہکار ایک اعلےٰ مصنف کی

روح ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک اچھا شعر ایک شاعر کی ہستی کا بہترین شاہکار ہوسکتا ہے جس میں وہ اپنی روح بھر دیتا ہے ؎

نہ ہو ناصح کی سختی سوں تکدر لے دل شیدا — سدا انقدِ محبت کا محک سنگِ ملامت ہے

ناصح کی سختی کلام کو سنگ ملامت سے تشبیہ دی ہے۔ اور محبت کی کسوٹی اسی کو قرار دیا ہے اس تخیل کو تقریباً ہر شاعر نے باندھا ہے۔ کیونکہ ناصح سے کبھی کوئی راضی نہیں۔ غالب یوں رقمطراز ہیں ؎

حضرتِ ناصح گر آئیں دیدہ و دل فرشِ راہ — کوئی مجھ کو یہ تو سمجھا دو کہ سمجھائیں گے کیا

آنے دو اُن کے لئے آنکھیں بچھی ہوئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کی سنتا کون ہے ؟ نتیجہ یہی ہوگا کہ اپنا سا منہ لے کر چلے جائیں گے۔ زندگی کی منجملہ اور دلچسپ ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حضرتِ ناصح تاک میں لگے رہتے ہیں کہ جہاں کچھ محبت کی بوباس ملی کہ چلے نصیحت کا دفتر کھولنے شعور کی شمع کو ہمیشہ کے لئے نہیں تو کبھی کبھی تو ضرور بجھا دینا چاہیئے۔ بقول اقبال ؎

اچھا ہے دل کے پاس رہے پاسبانِ عقل — لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

یہ بیماری شاید انسان کے علاوہ کسی دوسرے جانور میں نہیں پائی جاتی کہ وہ اپنی جہالت کو علم سمجھنے کی کوشش کرنا چاہتا ہے۔ ناصح صاحب کو اس کا علم نہیں۔ وہ سرے سے اس کوچہ سے نابلد رہے۔ وہ کیا جانیں کہ محبت کیا ہے اور نصیحت کا کیا اثر ہونے والا ہے تحصیلِ حاصل۔ محبت انسان کو ایک کارآمد چیز بنا دیتا ہے۔ عشق انسان میں انسانیت کی روح پھونک دیتا ہے غالب نے اگر بکا ہے تو اس شعر میں ؎

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

فانی تو ایسی تمنا کرتے ہیں ؎

وہ درد دے کہ موت بھی جسکی دوا نہو اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

اس میں شاعرانہ تعلّی کی شان لئے ہوئے تشبیہ کی بندش دیکھئے ؎

ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص ہر اک مصرعہ ترا موتی کی لڑ ہے

رگ جاں سوں ہوا ہے خون جاری یا دتیری پلک کی نشتر ہے

یاد مژگان نے نشتر کا کام کیا ہے اور رگ رگ سے خون جاری ہوگیا ہے ؎

دود ہ آتش کیا ہے سرمۂ چشم داغ دل دیدۂ سمندر ہے

کتنا نرالا تخیل ہے۔ اگرچہ بادی النظر میں کتنا آسان معلوم ہوتا ہے۔ معنوی خوبیوں سے مالا مال ہے اس کی سرمہ آلود آنکھوں نے دل کی نگری میں آگ لگا دی ہے۔ اس سے دھواں اُٹھ رہا ہے۔ دل میں اس آگ نے آبلے ڈال دئے ہیں جن کے داغ کو دیدۂ سمندر سے تشبیہ دی ہے سمندر وہ کیڑا جو آگ میں پیدا ہوتا ہے۔ اسی میں نشو و نما پاتا ہے۔ اسی میں زندگی بسر کرتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ عموماً جب آگ سرد ہو جاتی ہے تو اس کا بربطِ ہستی بھی خاموش ہو جاتا ہے۔ اس شعر میں تخیل کی رنگینی بھر دی ہے ؎

دل چھوڑ کے یار کیوں کہ جاوے زخمی ہے شکار کیوں کہ جاوے

چشمِ بیمار کی نرگس سے تشبیہ ایک پامال اور روندا ہوا قصہ ہے لیکن ندرتِ تخیل داد طلب ہے ؎

نرگس نمن رہے نہیں پل مارنے کی طاقت آ دیکھ اس انکھیاں کے بیمار کا تماشا

آنکھوں کی انتظار کی کٹھن منزلیں طے کرنے کے بعد کی کیفیت ایک عالمگیر مرض ہے آنکھیں پتھرا جانا ایک محاورہ بندش ہے۔ اسی شاعرانہ تخیل کو فانی سے سنیئے ؎

زہر ہے یاد ولے دل وہ ہیں کہ موت ہے قند رعشہ میری نظر میں ہے پاکفِ چارہ ساز میں

شمع تیری بزم میں جس وقت ہووے جلوہ گر ماہ نو لاوے اپس کو کر کے گلگیر طلا

محبوب کی بزم میں جو شمع جلتی ہے اس سے جو گل گرتا ہے ماہِ نو ایک طلائی چمٹا بن کر اُس گل کو اٹھانے کے لئے فلک سے اترتا ہے۔ بزم محبوب کی رفعت اور قدر داتی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

پیو کے نزدیک انجھو کو میرے وقار نہیں عالم میں گرچہ قدر ہے دُرِ یتیم کا

ساری دنیا دُرِ یتیم کی قدر کرتی ہے۔ موتی کو شعراء یتیم باندھتے ہیں کیونکہ وہ سیپی سے جدا ہو کر ملتا ہے میرے آنسوؤں کی قدر نہیں ہے حالانکہ لوگ موتیوں کی قدر کرتے ہیں پس شعر میں مراعاۃ النظیر اور تشبیہ کی صنعتوں کو ایک جان دیکھیے ؎

دیکھا ہوں قد و زلف و دہن جب سوں پیو کا کرتا ہوں جب سوں ورد الف لام میم کا

قد کی مناسبت سے الف کی تشبیہ، زلف کی تشبیہ لام سے اور دہن کی میم سے تشبیہ دی گئی ہے اسی قبیل کا ایک اور شعر ولی کا ہے جس میں رعایت لفظی کی صنعت تشبیہ کے ساتھ واقع ہے ؎

عجب نئیں ہے اگر ساقی فلک کا اے کماں ابرو تری مجلس میں لاوے جام روشن ماہ سیمیں کا

یہاں ابرو کی ماہ نو سے تشبیہ۔ اسی قبیل کا ایک اور شعر ہے ؎

سجدہ کرنے کوں روز آتا ہے ۔۔۔ چاند سر تا قدم ہو پیشانی

معشوق کی باتوں کو سن کر موتی کا پانی پانی ہو جانا ملاحظہ ہو ؎

مکھ سوں تیرے بچن مبارک سن ۔۔۔ گل کے گوہر ہوا سراپا آب

صنعت تضاد کی بندش دیکھئے ؎

اگر تجھ حسن کامل کی سنیں تعریف مہ رویاں ۔۔۔ تمام آکر کریں اقرار اپنی ناتمامی کا!

تمام اور ناتمامی میں صنعت تضاد ہے۔ اپنے معشوق کو حسن کامل سے تشبیہ دی ہے گویا میرے معشوق کے حسنِ کامل کی تعریف دنیا کے حسین سن پائیں گے تو اُن کو اپنی ناتمامی کا یقینی اعتراف ہوگا ؎

جگ کے دل لے برہمن کانپتے ہیں مثل بید ۔۔۔ جب سے یہ ہندوے خال دشمن ایماں ہوا

اس کے علاوہ تِل کو سپند، جیم کا نقطہ، زنگی، بیت انتخابی کا نقطہ وغیرہ تشبیہوں سے باندھا ہے۔ جوش ملیح آبادی کا تخیل خال کے باب میں ملاحظہ ہو ؎

ازل کے روز تری شکل جب بنائی تھی ۔۔۔ بنانے والے کو اتنی پسند آئی تھی

کہ دیر تک اسے دیکھا کیا تھا حسرت سے ۔۔۔ نظر جمائی تھی رخسار پر محبت سے

نظر نے اپنا کیا کام ایک مرکز پر ۔۔۔ سیاہ نشان بنایا نگاہ نے جم کر

خبر بھی ہے تجھے یہ سوزش نہاں ہے وہی ۔۔۔ سمجھ رہا ہے جسے خال یہ نشاں ہے وہی

استعارہ:۔ لغت میں استعارہ کے معنی ہیں عاریت لینا۔ مانگے پر لینا۔ مستعار لینا۔ تشبیہ میں جس چیز کو مشبہ بہ کہتے ہیں استعارہ میں اس کا نام مستعار منہ۔ یعنی لفظ کے حقیقی معنی نہ لئے جائیں

بلکہ وہ چیز جو اس سے مشابہ ہو۔ لہذا تشبیہ کی نگاہ سے جو معنی پیدا ہوں اس کو استعارہ کہتے ہیں مثلاً زید شیر ہے۔ شیر ایک درندے کا نام ہے لیکن اس مثال میں بمعنی دلیر استعمال ہوا ہے۔ گویا حقیقی درندے سے مجازی معنی کے لئے مانگ لیا گیا ہے۔ لہذا لفظ شیر مستعار ہوگا۔ اور درندہ مستعار منہ۔ اور زید کی ذات مستعار لہٗ ــ ذیل کی مثالوں سے یہ واضح ہو جائے گا۔

آتش — کبھی بت خانہ پوچھا گہ کیا طوف حرم ہم نے — اڑائی تیری خاطر خاک کن کن رہگذاروں میں

رند — مرے بیان کو سن سن کے کانپ اٹھا — غضب یہ ہے کہ سمجھتا نہیں زباں صیاد

زبان آلۂ سخن ہے اور یہاں خود سخن اور بولی مراد ہے یعنی میری بولی نہیں سمجھا۔

ولی کے یہاں استعارہ ہے لیکن بہت کم ہے

اولاً ریحاں و آخر لالہ رنگ — ظاہرا برگ حنا شمشیر ہے۔

ریحان سے شمشیر کی سبز دھار اور اس کا نتیجہ لالہ رنگ ہو جانا ــ حنا کی صفت شمشیر کو ودیعت کی گئی ہے۔ استعارہ کی ایک زبردست مثال دیکھئے ہے

عشق نہیں یہ ہنر بر آیا — دشمنِ ہوش و صبر آیا

مراعاۃ النظیر یا تناسب کلام میں کئی ایسی چیزیں مذکور ہوں جو باہم کسی قسم کی مناسبت رکھتی ہوں۔ لیکن یہ مناسبت بطور تضاد نہ ہو۔ یہ مناسب چیزیں کبھی ۲ دو ہوتی ہیں کبھی دو سے زیادہ مثلاً ہے

اقبال سکندر بجہاں گیری نظم — بر داشت بیک دست قلم را علم را

یا یہ شعر کسی کا ہے

ہر ایک مار سیاہ زلف و گیسو و کاکل   تمہارے بال ہیں یا کھیت ہے یہ کالوں کا

ولی کے دیوان میں اس صنعت کا ایک بحر رواں ہے مثلاً ؎

گردِ غم آبِ نین، عشق کے معمار نے لے   خانۂ عشق جگر سوز کوں تعمیر کیا

جس طرح شب ماہ میں چاند ابر کے ٹکڑوں سے کھیلتا ہے ولی الفاظ سے کھیلتے کھیلتے شعر ھال لیتا ہے اس شعر میں کیسے مناسب فقرے ہیں جن کو موتیوں کی طرح پرو کر شعر کا ایک مرصع گلوبند یار کیا ہے۔ خانۂ عشق کی تعمیر میں کیسی کیسی چیزیں صرف ہوئی ہیں جس کو پڑھ کر رگ رگ میں ایک آنچ کا سوس ہونے لگی۔ آسکر وائلڈ شاعر تھا تمثیل نگار تھا۔ نقاد تھا۔ اس کے ادبی نکات انگریزی بان میں شہرت و پاکیزگی کے بہترین نمونے ہیں لیکن اردو شاعری کی یہ ہنگامہ خیزیاں، سحر نگاریاں، یادو بیانیاں، کیف و اثر، دل میں چٹکیاں لینے والی ادا سی، شاعرانہ مصوری کی نظر فریبی ایک نیائے زندگی ہے۔ عشق و محبت کو شعراء نے سو سو طرح باندھا ہے جب ہی تو خدائے تعالیٰ نے مجنوں سے فرمایا تھا ؎

خوش نماید نالۂ شب ہائے تو   ذوق ہا دارم بیارب ہائے تو

شاعری کی بنیاد اس پر رکھ دی ہے۔ اسی تخیل کو بیخود یوں باندھتے ہیں ؎

محبت دل میں رکھ دی یا بلا ناگہاں رکھ دی   الٰہی تونے یہ دوزخ کی چنگاری کہاں رکھ دی

یا کسی ایرانی شاعر نے یوں ظاہر کیا ہے ؎

محبت است کہ دل رانمی دہد آرام   دگر نہ کیست کہ آسودگی نمی خواہد

ولی نے بے خوابی کا تذکرہ کس نزاکت سے کیا ہے ؎

آج کی رین مجھ کو خواب نہ تھا دونوں انکھیاں میں غیر آب نہ تھا

خواب کی مناسبت سے رات کا ذکر، اور پھر نیند کیسے ٹھہرے ۔ ان آنکھوں میں جو تمام تمام رات گنگا جمنا بہی رہتی ہیں آنسوؤں کے بے پناہ سیلاب نے نیند کے فرشتوں کی بھی نیند حرام کردی اسی جادو کو غالب نے یوں جگایا ہے :-

موت کا ایک دن معین ہے نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

یا کسی اور شاعر کے اس شعر میں اسی تخیل کی بلند پروازی ملاحظہ ہو ؎

رات دن دھوم مچائیں جو مرے طفل سرشک سچ ہے پھر خواب کا کیونکر ہو گذر آنکھوں میں

پھر اسی صنعت کو ولی کے یہاں دیکھئے اور تخیل کی رنگینی کو مہندی میں گھول کر رشک کا قابل رشک پیرایۂ ادا ملاحظہ فرمائیے ؎

دیکھ کر پاؤں کی ترے مہندی مجھ کوں تلوؤں سے آگ لاگی ہے

لارڈ میکالے کی طرح " ولی بھی اپنے انداز کا بادشاہ ہے "۔

معشوق کے پان کھانے پر کیا خوب بات کہی ہے جس میں وہی تناسب الفاظ کی کیفیت ہے اور کس حسن وخوبی ونزاکت سے ؎

مجھے اچرج ہی آتا پیا کے پان کہانے کا نہ جانوں کیا سبب یاقوت اصلی کے رنگانے کا

اسی صنعت کو دہرانے میں آنکھوں کی جو ولی نے تعریف کی ہے اس میں تو آسمان و زمین ایک کر دیا ہے ؎

سحر پرداز ہیں پیا کے نین ہوش دشمن ہیں خوش ادا کے نین

سفر عشق کیوں نہ ہو مشکل　　غمزۂ چشم یار رہزن ہے

برہ کی بارگہہ میں مجھ کوں جا دے　　مجھے اس شوق کی عشرت سدا دے

یہ دل معمور کر جیوں شیشۂ مل　　پریشانی نہ دے مانند سنبل

برہ کے باغ میں دے آب داری　　ہمیشہ رکھ جھڑی نیناں کی جاری

نا کہے تجھ کو خلق ماہ تمام　　زلف تیری کو حق نے لام کیا

ناہید میں کسی نے نہ دیکھی یہ دلبری　　تجھ مہر کا ہوا ہے دل و جان مشتری

اس ملاحت کے نون کی لذت　　جس کا دل ہو کباب وہ جانے

سیج سن آب اس کی جگ میں کا نیا　　سمندر موج زن رگ رگ میں کانپا

اس صنعت میں ولی کی "آہ" کے نقوش نے اس کے دیوان میں چار چاند لگا دیے ہیں کہ بے اختیار زبان سے "واہ" نکل جاتی ہے ؎

باج حق کے نہیں کوئی واقف ہماری آہ کا　　مد ہے یہ دیوان بے تابی کی بسم اللہ کا

ملٹن اصلیت، جوش اور خلوص کو شاعری کے اجزائے ترکیبی پر محمول کرتا ہے۔ ورنہ اس کے نزدیک شاعری بے جان اور مصنوعی سی چیز ہے۔ ولی کی ندرت تخیل کے ایسے سیکڑوں نمونے دیوان ولی میں بکھرے پڑے ہیں ؎

معشوق کوں ضرر نہیں عاشق کی آہ سے　　بجھتا نہیں ہے باد صبا سوں چراغ گل

کیونکر چھپا سکوں میں تجھ درد کی حقیقت　　ہے کام آہ دل کا افشائے راز کرنا

جب آہ و نالہ سے کچھ بن نہیں پڑتی تو شدت یاس و الم میں چیخ اٹھتا ہے ؎

اور مجھ پاس کیا ہے دینے کوں دیکھ کر تجھ کو رو ئے دیتا ہوں

غالبؔ کے یہاں اس تخیل کو یوں سنئیے ؎

ضعف میں طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے بات کچھ سر تو نہیں ہے کہ اٹھا بھی نہ سکوں

اس صنعت کی دنیا جیسے کہ کہا گیا ہے ولیؔ کے سنسار میں بہت وسیع ہے ؎

کیا مجھ عشق نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ کہ آتش گل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

عشق و آتش کی تشبیہ معشوق و گل کی مناسبت، اور ردیف کی مضبوطی جو اساتذۂ قدیم کا طرۂ امتیاز تھا قابل داد و لائق تحسین ہے۔

اسی صنعت سے متعلق ولیؔ کا یہ شعر ؎

دیکھ اس کی کلاہِ بارانی چاند پر آج ابر آیا ہے۔

طبا طبائی کے تخیل سے ٹکراتا ہے ؎

آج وہ اوڑھ کے نکلا ہے ڈوپٹہ آبی آسماں رنگ بدلتا نظر آتا ہے مجھے

اشعار میں محاوروں کی کھپت خود ایک بے مثل صنعت ہے۔ اس شعر کی تخیل آرائی اور بندش غالبؔ کی خیال آفرینی سے کیسی مناسبت رکھتی ہے ؎

جب نقش اس صنم کا نقاش کھینچتا ہے بازو کے کھینچنے سے وہ ہاتھ کھینچتا ہے

غالبؔ کو اپنے معشوق کی چابک دستی پر ناز ہے ؎

نظر لگے نہ کہیں اس کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

مومن کے اس تخیل کا مفہوم ؎

جائیں وحشت میں ہوئے صحرا کیوں کم نہیں اپنے گھر کی ویرانی

ولی کے یہاں یوں ملتا ہے ؎

سیرِ صحرا کی توں نہ کر ہرگز دل کے صحرا میں گر خدا پایا

فرق اتنا ہے کہ مومن صرف گھر کی وحشت کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ اور گھر کی ویرانی کو صحرا کی آشفتگی پر ترجیح دیتے ہیں لیکن ولی خدا کو دل کے ویرانے میں ڈھونڈھنے کی خواہش کرتا ہے۔ ولی کا شعر تصوف کی چاشنی لیے ہوئے ہے۔ اور اس میں وہ نکتہ بھی حل ہوتا ہے کہ خدا شہ رگ سے بھی قریب ہے وہ بلند آسمان ہی پر نہیں۔ غالب کے یہاں اس ہنگامے کو دیکھیے ؎

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

تنسیق الصفات:۔ ایک موصوف کی کئی صفتوں کا پے در پے ذکر کرنا ؎

خداوند بخشندہ و دستگیر کریمِ خطا بخش و پوزش پذیر

ولی کے یہاں اس صنعت کی تمثیل دیکھئے ؎

نگاہ تیز، و پلک تیز، غمزہ تسیر تیز ہوئے ہیں دل کے لئے یہ تمام نشتر تیز

ترا مکھ مشرقی، حسن انوری، جلوہ جمالی ہے نین جامی، جبیں فردوسی و ابرو ہلالی ہے

ولی کے کلام کی یہ ندرت نہایت انوکھی ہے کہ وہ اپنے محبوب کے سراپا کو شعراء کے کلام سے بڑے بانکپن سے تشبیہ دیتا ہے۔ یعنی اتنی صفات اس کے معشوق میں بہ یک وقت موجود ہیں کسی نے حیات کی صفات پر یوں روشنی ڈالی ہے ؎

قابلِ ذکر نہیں تلخیٔ ایامِ حیات طائرِ روح ہے بے چین تہہ دامِ حیات

عمر کے ہاتھ سے اب گرنے کو ہے جامِ حیات روح فرسا ہے بہت تیرگیِ شامِ حیات

ولیؔ ؎ مجھ سوں کیونکر ملے گا حیراں ہوں شوخ ہے بیوفا ہے سرکش ہے

ایک اور جگہ اپنے محبوب کے صفات کی ہندی کی چندی اس طرح کی ہے ؎

رحم کرتا نہیں ہمارے حال پہ شوخ ہے، سرکش ہے، بے انصاف ہے

ایک اور جگہ رقیب کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے ؎

ولیؔ میری تواضع سوں رقیبِ سنگدل دائم پشیماں ہے خجل ہے منفعل ہے سخت رسوا ہے

سراپا دیکھئے ؎ دیکھ سروِ چمن ترے قد کو خجل ہے، پاگل ہے، بے پر ہے

حسنِ تعلیل:- تمام مظاہر قدرت کی کچھ نہ کچھ علت ہوتی ہے۔ جن کی وجہ سے وہ ظہور میں آتے ہیں لیکن صنعت حسنِ تعلیل میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نتیجہ کا صحیح سبب اور ہر معلول کی صحیح علت بیان کی جائے۔ بلکہ کسی چیز کی ایک ایسی علت فرض کرلی جاتی ہے جو دراصل اس کی علت نہیں مثلاً؟

بھلائی جو کرے دنیا میں وہ ہوئے پامال بسان جادہ کسی کو تو راہ مت بتلا

راستہ کی پامالی کی یہ وجہ ہے کہ وہ راہ نمائی کرتا ہے اس لئے دنیا میں جو لوگ نیکی کرتے ہیں وہ پامال ہوتے ہیں ؎

چرخ پر بیٹھ رہے جان بچا کر عیسیٰ ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا

فراق خلد سے گندم ہے سینہ چاک اب تک الٰہی ہو نہ وطن سے کوئی غریب جدا

رہتا ہے سیہ پوش سدا خانۂ کعبہ اس غم میں کہ تھا پہلے صنم خانہ کسی کا

(ع) بے مہری من زرد کند روئے درم را

کچھ آج شکستہ ہے بہت رنگ رخ گل
صیاد نے کس بلبل شیدا کو ستایا

وضع زمانہ قابل دیدن دوبارہ نیست
رو پس نکرد ہر کہ ازیں خاکداں گذشت

اب ولی کے یہاں اس صنعت کے نقوش دیکھئے ؎

لیا تعلیم میں ہے آسماں نے
تری رفتار سے طرز تحمّل

اس آب روح فزا کے کمال لطف کو دیکھ
چھپا ہے پردۂ ظلمت میں آب حیوانی

آب حیواں زندگی جاوید بخشتا ہے۔ اس وصف خاص میں اس کا ہمسر کوئی نہیں لیکن باران رحمت نے دنیا کے ذرے ذرے کو اس طرح سیراب و شاداب کر دیا ہے کہ آب حیوان (آب حیات) نادم ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ فیوض و برکات میں وہ باران رحمت کا حریف نہیں بن سکا چنانچہ احساس ندامت سے وہ پردۂ ظلمت میں روپوش ہے۔ ولی نے اس تعلیل میں واقعیت اور خیال آفرینی دونوں کو بکمال استادی برقرار رکھا ہے تعلیل کی دوسری مثال ؎

آج تیری نگہہ نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا

جب انسان حضوری قلب کے ساتھ اپنے مالک کے حضور میں نماز کے لئے کھڑا ہو جاتا ہے تو اس پر ایک کیف و محویت کا عالم محیط رہتا ہے۔ وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کے تصور کے سنساریں تو صرف اسی ذات کی حکومت رہتی ہے جس کے سامنے وہ سربسجود ہوتا ہے۔ ولی اس محویت کو ہوش کھو جانے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ آج جو سارے نمازیوں پر ایک کیف و محویت کا عالم طاری ہے یہ محض اس لئے کہ تو مسجد سے گذرا ہے اور تیری ہی نظر کی یہ ساری کرشمہ سازیاں ہیں کہ سب نمازیوں کے ہوش و حواس پرّاں ہیں کسی نے اس صفت کو کس حسن و خوبی سے باندھا ہے ؎

ہنگامِ شرعِ گریہ یہاں بیکسی کا تھا — تم ہنس پڑے یہ کونسا موقع ہنسی کا تھا

ولی کے یہاں حسنِ تعلیل کی ایک حسین ترکیب اس شعر میں ملے گی ؂

ترے جو قد سوں رکھا نیشکر نے دلیں گرہ — تو کھینچ پوست کیا اس کا بند بند جدا

ترکیب میں حسنِ بیان کے ساتھ ساتھ نزاکت، ندرت اور حلاوت بھی ہے۔ یا پھر اس شعر میں اس صنعت کو کیسی خوبصورتی سے باندھا ہے ؂

ہے حسن ترا ہمیشہ یکساں — جنت سوں بہار کیوں کہ جاوے

ایک اور مثال ؂

اگر وہ رشکِ گلزارِ ارم گلشن طرف جاوے — عجب نہیں باغ میں مالی کیئے پر اپنے پچھتاوے

پریشانی کے نکتے کا معلم اسکوں کہہ سکیئے — تری زلفِ پریشاں کا صنم جس میں سودا ہے

سودا اس تخیل کو کس انوکھے طرز سے باندھتے ہیں ؂

تری زلفوں سے اپنی روسیاہی کہہ نہیں سکتا — کہ ہے جمعیتِ خاطر مجھے ان کی پریشانی

اس صنعت کی پُر کیف تجلی اس شعر میں ملاحظہ ہو ؂

مرتا ہے دراز کاکلوں پہ — فہمی کی حیات بڑھ گئی ہے

تلمیح:۔ اثنائے کلام میں کسی مشہور قصہ یا مسئلہ کی طرف اشارہ کرنا۔ غالب ؂

سب رقیبوں سے ہیں ناخوش پر زنانِ مصر سے — ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

عاشق اس غیرتِ بلقیس کا ہوں میں آتش — بام تک جس کے کبھی مرغِ سلیماں نہ گیا

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد — ڈرتا ہوں آدمی سے کہ مردم گزیدہ ہوں

ذوق — موت نے کر دیا ناچار وگرنہ انساں — ہے وہ خود بیں کہ خدا کا بھی نہ قائل ہوتا

غالب — ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا — باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا!

سکندر آیا جہاں نابینا جو تا لبِ گور — صدا یہ کان میں آئی دہانِ تربت سے

کہ اب کیجیے کام ورسن سے پیمائش — یہاں کی ہوگی مساحت جریبِ قامت سے

یا ناسخ کے اس بند میں تلمیح کی دلنشیں بندش دیکھئے :—

شرمندۂ شاہِ کربلا ہے پانی — کیا فیض سے محروم رہا ہے پانی

گرتے ہیں جو اشکِ چشم ثابت یہ ہوا — گویا نظروں سے گر گیا ہے پانی

سیماب — بدل گئیں وہ نگاہیں یہ حادثہ تھا اخیر — پھر اس کے بعد کوئی انقلاب ہو نہ سکا

(اکبر الہ آبادی) دیر و حرم کو چھوڑا اللہ رے فضولی — یہ کیا ضرور تھا جب دل سا مکاں بنایا

غالب — قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیِ منصور نہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے اپنا مسجود — قبلے کو اہلِ نظر قبلہ نما کہتے ہیں

کسی کے اس شعر میں تلمیح کی تمثیل دیکھئے :—

دل کے ہوتے ہوئے جاتے ہو کہاں اے مولیٰ — اس میں کچھ جلوے ہیں ایسے کہ سرِ طور نہیں

زلیخا کیا ملا تجھ کو جو تو نے چاک کر ڈالا — نمازِ عشق پڑھنی تھی تجھے یوسف کے دامن پر

ولی کی تلمیح ملاحظہ ہو ؎

حق نے "لولاک لما" حق میں محمدؐ کے کہا — ان سوا کون سے مرسل نے یہ رتبہ پایا

ولی کے یہاں اس صنعت کی ایک حسین ترکیب اس شعر میں ہے :—

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز   تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

اِسی وزن، اسی بحر اور اسی تخیل کو امیر خسرو سے سنیئے ؎

جاں زتن بردی و در جانی ہنوز   دردہا دادی و درمانی ہنوز

ولی کے اس بند میں تلمیح کی بندش قابلِ داد ہے ؎

گنجِ مخفی کی نہیں کنجی ہے بسم اللہ بِن   قفلِ دل کھلتا نہیں ہے گا ہمارا آہ بِن
رودِ نیل آنکھوں سوں جاری ہے ندی نالے منج آب   باؤلی ہو گئی ہے یوسف کی زلیخا چاہ بِن

ایک دوسرا بند جس میں اس صنعت کو کس نزاکت سے باندھا ہے ؎

کونین حسنؑ حسینؑ کا ممنوں ہے   اس یاد سوں عشرت کا سینہ محزوں ہے
ایسوں کے اُپر روا رکھا داغ، فلک   جس داغ سوں لالہ جگر پر خوں ہے

واقعہ کربلا کی طرف اشارہ تھا اب قصہ فرہاد کو سنیئے ؎

بسے فرہاد کے مانند کوہِ بے ستوں منج   اگر قصہ سنے خسرو تری شیریں بیانی کا
ترا خطِ خضر رنگ اے شوخ   سلطان ہے خشکی و تری کا!

تلمیح ہے واقعۂ خضر کی طرف، جو حسبِ روایت پانی میں غائب ہو گئے ہیں اور جو قیامت تک زندہ رہیں گے۔ اس شعر میں صنعتِ تشبیہ تلمیح کی طرز لئے ہوئے ہے ؎

ترے لب اور ترے ابرو کو دیکھے   پڑھوں شعر زلالی اور ہلالی

فرہاد و شیریں کی تلمیح ؎

اگر ٹک گھر سوں وہ گلگوں قبا شیریں بچن نکلے   مرے سینہ سوں تیشہ سا آہِ کوہکن نکلے

قصۂ منصور کی طرف اشارہ ہے ؎

کثرت کے پھول بن میں جاتے نہیں ہیں عارف بس ہے موحداں کوں منصور کا تماشہ

اس شعر میں دو مشہور واقعات کی طرف اشارہ ہے ؎

ترا لب دیکھ حیواں یاد آوے ترا مکھ دیکھ کنعاں یاد آئے

حیواں اشارہ ہے آبِ حیات کے چشمہ اور خضرؑ کے قصہ کی طرف۔ کنعاں سے مراد حضرت یوسفؑ ہیں۔ اس میں تشبیہ و استعارہ کی صنعتیں بھی مضمر ہیں ؎

ادب کے اہتمام آگے نہ پاوے بار وصال ہرگز ترے سایہ کی پابوسی کوں گر رنگِ ایاز آوے

اس قصہ کو ولی سے تو سن لیا اب اقبال سے سنیئے ؎

نہ وہ عشق میں رہیں گرمیاں نہ وہ حسن میں رہیں شوخیاں نہ وہ غزنوی میں تڑپ رہی نہ وہ خم ہے زلفِ ایاز میں

ایک دوسرے شعر میں کوئی اور ہی فلسفیانہ بحث ہے تلمیح کی شان لئے ہوئے ؎

فلاطوں ہوں زمانہ کا سجن جب تجھ گلی آوے نہ پوچھو طفلِ مکتب کر اگر وہاں بو علی آوے

بربطِ سخن کے اسی ساز کو انشاؔ یوں چھیڑتے ہیں۔ شاعرانہ تعلّی کی داد دینے کو جی چاہتا ہے ؎

ایک طفلِ دبستاں ہے فلاطوں مرے آگے کیا منہ ہے ارسطو جو کرے چوں مرے آگے

پھر ولی سے سکندر کا قصہ سنیئے ؎

سجن! میں خواب میں دیکھا ہوں تیرے مکھ کا آئینہ عجب نہیں گر مرے گھر دولتِ اسکندری آوے

غالب نے سکندر کے قصہ پر یوں روشنی ڈالی ہے ؎

کیا کیا خضر نے سکندر سے اب کسے رہنما کرے کوئی

ولی سے حضرت علی کی تلوار کا بیان سنئیے ؎

جاتی ہے حاسداں کے یوں دل میں ہیبت میری سینے میں دشمناں کے جوں ذوالفقار جاوے

آرزو سے کسی دوسرے ہی مشہور واقعہ کو سنیئے ؎

دریائے اشک اپنا جب سر پہ اوج لاوے طوفان نوح بیٹھا گوشہ میں موج مارے

نوح کی تلمیح ولی نے اسطرح باندھی ہے:۔

نوح تجھ رحمت کی کشتی باج کہیں پاوے نہ ٹھاہ تجھ غضب کا گر سمندر جوش طوفانی کرے

شاعر نے کتنا کہا؟ یہ ضروری سوال نہیں ہے۔ کیا کہا؟ اور کیسا کہا؟ اصل موضوع بحث ہے تاریخی پس منظر پر روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ اردو شاعری جذبات سے مالامال ہے کسی مرکزی موضوع پر مسلسل رواں اور بے ساختہ اشعار لکھے جائیں، زبان سلیس، موثر اور حقیقی جذبات سے مملو ہو تو یہی شاعری کی معراج ہے۔ لفظی توازن اور جذباتی خلوص زبان کو زندہ جاوید بنانے والے اسباب ہیں۔ ولی ؎

جگ میں تئیں اہل ہنر اپنے ہنر سوں بہرہ پائے کوہکن کوں فیض کب پہنچا ہے جوئے شیر سوں

غالب تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ سرگشتۂ خمار رسوم و قیود تھا

رد العجز علی الصدر:۔ یہ صنعت شعر سے تعلق رکھتی ہے۔ اور اس کے سمجھنے سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہئیے کہ علم عروض کی اصطلاح میں پہلے مصرعہ کے جزو اول کو صدر اور جزو آخر کو عروض دوسرے مصرعہ کے جزو اول کو حشو کہتے ہیں رد العجز علی الصدر کی تعریف یہ ہے کہ جو لفظ شعر کے حصہ عجز میں واقع ہوا ہے وہی صدر یا عروض یا ابتدا یا حشو میں مکرر لایا جائے۔ یہ الفاظ

خواہ بعینہٖ مکرر ہوں یا ایک دوسرے کے مجنس ہوں یا ایک دوسرے سے مشتق ہوں یا مشتق کے مشابہ ہوں۔

گویاؔ	محمدؐ سے صفت پوچھو خدا کی	خدا سے پوچھیے شانِ محمدؐ
مومنؔ	دل اب کی بار ہوا ایسی بے جگہ مائل	کہ جان کو بھی ٹھکانے لگا رکھے گا دل
ظفرؔ	نکالے ہیں یہ اشکِ گرم ہم نے	کہ چشم ترسے ہیں اخگر نکالے
ناسخؔ	دے گھٹا کو نہ مرے دیدۂ تر سے نسبت	آبرو میری نہ ہم چشموں میں اے یار گھٹا
ایضاً	سودۂ الماس کھا کر سو رہوں	زندگانی ہجر میں بے سود ہے
ناداںؔ	کھینچ کر نالہ مصور رہ گیا	جب کہا تو یار کی تصویر کھینچ
غالبؔ	ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے	یار کا دروازہ پائیں گر کھلا
رقتؔ	ہمارے سامنے مت ابر بار بار برس	جو ہم سے ہو سکے تجھ سے نہ ہو ہزار برس
دبیرؔ	یہ پوچھنا میں بھول گئی وائے مقدر	تاریخ مقرر نہیں آنا ہے مقرر
میر حسنؔ	بھری تھی دلوں سے زلبس اسکی مانگ	بہت دل لئے اس کی کنگھی نے مانگ
ظفرؔ	جگر کے کرتے ہیں ٹکڑے یہ پارۂ الماس	پیئے جو اشک کوئی تبلا سمجھ کے پیئے
میرؔ	جہاں میر زیر و زبر ہو گیا	خراماں ہوا جب وہ محشر خرام
	مٹا مٹا کے بناتا ہوں دل کی بستی کو	بنا بنا کے یہ دنیا بگاڑتا ہوں میں
	ان سے پہلی سی ملاقات گئی	وہ جو اک بات تھی وہ بات گئی
	یا تو کہتے نہ تھے فسانۂ دل	یا مگر بار بار کہتے ہیں۔ !

ہنس ہنس کے وہ مجھ سے ہی میرے قتل کی باتیں
اس طرح سے کرتے ہیں کہ گویا نہ کریں گے۔!

بال کھولے وہ تماشہ کر گیا — ہو گیا عشاق پر جینا وبال

حالی — لگاؤ تو لو اپنی اس سے لگاؤ! — جھکاؤ تو سر اس کے آگے جھکاؤ

جگر — آغاز محبت کا انجام بس اتنا ہے — جب دل میں تمنا تھی اب دل ہی تمنا

جرأت — مشاطہ ترے گھر سے جب لے کے نبات آئی — لب بند ہوئے سب کے کچھ منہ سے نہ بات آئی

دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے — ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے

جیتے ہی جی کیا ملک فنا میں ساتھ بشر کے جھگڑے ہیں
مر کے ادھر سے جب کہ چھٹے تو جا کے ادھر کے جھگڑے ہیں

اب ولی کو اس صنعت کے رنگ میں دیکھئے ؂

کم نما ہے نوجوان میرا برنگ ماہِ نو — ماہ نو ہوتا ہے اکثر اے عزیز و کم نما

اس تخیل کو داغ کی زبان میں یوں سنئے ؂

آئے بھی وہ تو منہ کو چھپائے مرے گئے — اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے گئے

یا پھر ولی اس صنعت کو یوں لاتے ہیں ؂

مجھ کو ہے دار الامن پیو کا نقش چرن — پیو کا نقش چرن مجھ کو ہے دار الامن

یہ شاعرانہ غلو نہیں تو کیا ہے شاعر اپنے ممدوح کو ساتویں آسمان پر بٹھا دیتا ہے۔ اس کے نقش قدم میں امن کا گھر ڈھونڈھتا ہے۔

تجھ پلک کا بیان کیوں کہ کروں جس کی ہے یا د مجھ کوں نت پل پل
اے حیلہ گر رندتری حیلہ گری دیکھ سب حیلہ گراں ترک کئے حیلہ گری کوں
پوچھو نہیں طبیب سوں مجھ درد کا علاج بیمار کوں برہ کے غرض نہیں طبیب سوں
اسی تخیل کو متاخرین سے یوں سنیئے ؎
پانی طبیب ہے ہمیں کیا بجھا ہوا دل ہی ہے زندگی سے ہمارا بجھا ہوا

ایہام :۔ ایہام کے لغوی معنی وہم میں ڈالنا ہے۔ صنعت ایہام یہ ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوں ایک قریب دوسرے بعید۔ متکلم بعید معنی مراد لے۔ ایک پھول کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں۔ رنگ کے معنی ایک تو معمولی رنگ سرخ و سفید۔ دوسرے طرز بیان اور یہاں یہی معنی مراد ہیں یعنی سو طرح سے باندھوں ؎

جب تک یہ چمک مہر کے پرتو سے نہ جائے اقلیم سخن میری قلم رو سے نہ جائے (انیس)
بستے ہیں تیرے سایہ میں سب شیخ و برہمن آباد ہے تجھ سے ہی تو گھر دیر و حرم کا (درد)
ہجر میں گھل گھل کے آدھا ہو گیا لے مسیحا اب میں موسا ہو گیا (وزیر)

لفظ موسیٰ وہم میں ڈالتا ہے۔ اور موسیٰ علیہ السلام کی طرف خیال جاتا ہے۔ اور یہاں وہ معنی مقصود نہیں ہیں۔ بلکہ مو کے معنی بال ہیں اور سا حرف تشبیہ ہے یعنی میں بال جیسا ہو گیا ؎

چھیڑنا زلف کا مشاطہ برا ہوتا ہے ہاتھ اس جرم پہ شانے سے جدا ہوتا ہے (گویا)
بنو گے خسرو اقلیم دل شیریں زباں ہو کر جہاں گیری کرے گی یہ ادا نور جہاں ہو کر (اکبر)

رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا (غالب)

بیمار کو جان کھو تے کیا دیر بینڈ آ ہی گئی تو سو نے کیا دیر

نکلے تم آ، صبا کی طرح جب چمن میں بھول گلشن کو دیکھ تجھ کو گئے ہاتھ پاؤں پھول

اب ولی کے یہاں اس صنعت کی نوک جھونک یہ ہے ؎

موسیٰ جو آ کے دیکھے تجھ نور کا تماشہ اس کو پہاڑ ہوئے پھر طور کا تماشہ

یہاں پہاڑ سے کوہ طور کی طرف ذہن منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ نہایت مشکل کام کی طرف اشارہ ہے ؎

مذہب عشق میں تری صورت دیکھنا ہم کو فرض عین ہوا

عین کے معنی آنکھ اور دوسرے معنی بالکل۔ یہاں دوسرے معنی مراد ہیں۔

ایک کہتے ہیں کہ یہ کعبہ ہے اس میں پتلی نے کیوں کیا ہے محل

پتلی مردمک چشم کو بھی کہتے ہیں اور پتلی صنم کی طرف بھی اشارہ ہے اور یہاں یہی معنی مراد ہیں کہ پتلی کا خانۂ کعبہ میں کیا کام؟

زہرہ جبیناں خلق کے آویں برنگ مشتری گر ناز سوں بازار میں نکلے وہ ماہ مہرباں

مشتری خریدار کو کہتے ہیں اور مشتری ایک ستارہ کا بھی نام ہے اور یہاں بھی یہی مفہوم ہے

اس کے خط و خال سوں پوچھو خبر پوچھتا ہندو ہے باتاں بید کی

ہندو اشارہ ہے خط و خال کی سیاہی کی طرف اور ہندو سے ہی بید (یعنی وید) کے رمز معلوم ہوتے ہیں۔ کیسی نازک خیالی ہے اس شعر میں کہ بے اختیار داد دینے طبیعت چاہتی ہے

ترے نین کے عصر میں بے وقر ہے شراب　　مے خانہ تجھ نگاہ سوں دائم خراب ہے

چمن کی سیر سوں نفرت ہے اس سبب کے مجھے　　سفید داغ سوں مکروہ ہے سمن تجھ بن

سفید داغ سے برص کی بیماری مراد ہے۔ اور چنبیلی کا پھول بھی سفید ہوتا ہے۔ ولی کی نظر میں اس کے معشوق کے بغیر سیرِ گلشن بے کیف ہے۔ اسی تخیل کو سودا نے یوں پیش کیا ہے ؂

آوے گا وہ چمن میں نہ اے ابر جب تلک　　پانی گلوں کے منہ میں چوایا نہ جائے گا۔

ولی۔ اگر بازار میں خوبی کے وہ رشکِ پری آوے　　عجب نہیں گر فلک سیتی سُرج ہو مشتری آوے

جب لگ نہ دیکھا تھا تجھے دل بند تھا اوراق میں　　تیری بھنواں کوں دیکھ کر جزدان چھوڑا طاق میں

طاق کے دو معنی ہیں ایک تو طاق جس میں جزدان رکھ دیا دوسرے طاق ابرو مراد ہے یعنی دل بھوں کے نذر کردیا۔ اس میں معشوق کے ابرو کو طاق سے تشبیہ دی ہے۔

سجن کے حسن کا قرآں پڑھا ہم نے نظر کرکر　　نہ پایا کچھ غلط اس میں دکیا زیر و زبر کرکر!

زیر و زبر میں ایہام ہے۔ دفترِ حسن کو قرآن سے تشبیہ دی ہے۔ زیر و زبر کرنا یعنی الٹ پلٹ کر دیکھنا۔ دوسرے معنی زیر و زبر کے یہ ہیں کہ اعراب لگانا۔ یوں صفحۂ حسن کا ہر طرح کامیاب ثابت ہونا کیتی انوکھی اور دلنشیں ترکیب ہے۔

مبالغہ:۔ کسی شخص یا کسی شے میں کسی وصف یا کیفیت کا بیان خواہ بطور تعریف ہو یا مذمت اس طرح کرنا کہ نفس الامر میں وہ وصف اس حد تک اس شے میں نہ پایا جاتا ہو۔ بہ الفاظ دیگر کسی وصف کو شدت اور ضعف میں انتہا تک پہنچا دینا۔ اس کی تین قسمیں ہیں تبلیغ کسی وصف کا شدت اور ضعف میں اس حد تک پہنچنا کہ اگر عقلاً اور عادتاً ممکن ہو جائے مثلاً ؂

چناں دارم ایں راز را روز و شب   کہ با جاں بود گر بر آید ز لب

اگر عقلاً ممکن اور عادتاً بعید اور محال ہو تو اسے اغراق کہتے ہیں۔ مثلاً ؎

دلم چیہ در دگر انمایہ چوں جگر ز فغاں   ز ماغم از گلہ خالی چو خاطرم ز غبار

(۲) عقلاً ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی سے تکلیف پا کر شکایت نہ کرے۔ نہ دل پر میل لائے مگر عادتاً یہ غیر ممکن ہے۔

(۳) تیسری قسم عقل و عادت دونوں اعتبار سے محال ہے۔ اس کا نام غلو ہے ؎

تنم از ضعف چناں شد کہ اجل جست و نیافت   نالہ ہر چند نشاں داد کہ در پیرہن است

ولی کے یہاں کی تشبیہ سے بھری ہوئی دنیا میں مبالغہ کی نقل و حرکت دیکھیے ؎

دونوں جہاں کی عید کی ہے آرزو اگر   پیتم کے ابروؤں پہ دو ٹک ہلال دیکھ

نالہ و آہ کی تفصیل نہ پوچھو مجھ سوں   دفتر درد لبا عشق کے دیوان میں آ

یک نقطہ ترے صفحۂ رخ پر نہیں بے جا   اس مکھ کو ترے صفحۂ قرآں سوں کہوں گا

بدخشاں میں پڑیا ہے شور تیرے لعل رنگیں کا   ہوا ہے چین میں شہرہ تری اس زلف پر چیں کا

اے صنم تیرے رخ کی ہے وہ چمک   منفعل ہے مدام شمس فلک

دیکھ تجھ میں جناب حق کا ظہور   ہیں دعا گو فلک پہ سارے ملک

تجھ تجلّی کے صحیفے کا سورج ہے یک ورق   عکس تیری زلف کا جگ میں شب دیجور ہے

سورج باوجود اس کے کہ سارے عالم کو اپنی جھلک دکھا کر نور سے بھر دیتا ہے محض چہرۂ معشوق کا ایک پرتو ہے اور رات جو اتنی تاریک اور سنسان ہے اس میں زلف محبوب کی سیاہی

ذم ہوگئی ہے۔ شاعر اپنے معشوق کی تعریف میں آسمان و زمین کے قلابے ملا دیتا ہے۔ کائنات کی اس کے مقابلہ میں کوئی حقیقت ہی نہیں رہتی جس طرح عارف کو ہر ذرّہ عالم میں خدا نظر آتا ہے اسی طرح شاعر کے سنسار میں صرف اس کے محبوب کی حکومت ہے۔ اس کے تخیل کی نگری اسی سے آباد ہے

انجھواں کی سرخی دیکھ کر یاقوت ہے خوں جگر　　اور زعفراں ہے زرد رو دیکھے سوں رنگ عاشقاں

اس شعر میں کئی صنعتیں موتی کی طرح پرو دی گئی ہیں۔ مثلاً "زرد رو" محاورہ ہے۔ اس کے معنی ہیں نادم و شرمسار ہو جانا۔ دوسرے معنی ہیں زرد پڑ جانا یعنی چہرہ فق ہو جانا۔ اس میں ایہام ہے لیکن مبالغہ کی صنعت غالب ہے۔ عاشق کے آنسو جو سرخ ہیں ان کے دیکھے سے یاقوت کا جگر خون ہو گیا ہے یعنی لعل جو ایک پتھر ہے وہ بھی اس واقعہ سے متاثر ہے۔ زعفران کے چہرہ کی زردی چہرۂ عشاق کا ایک عکس ہے ؎

نِس دن سجن تجھ ہجر میں رہتے ہیں باز چشم وا　　تا دُزدِ خواب آوے نہیں پتلی ہے اس میں پاسباں

نِس یعنی رات۔ اس میں تشبیہ کی صنعت کے دلنشیں جوڑ نے مبالغہ کی صنعت میں جان ڈال دی ہے ہجر میں جو انتظار ہے اس سے رات دن آنکھیں کھلی ہیں۔ پلک سے پلک نہیں جھپکتی۔ پتلی نیند کے چور کی پاسبان ہے۔ پھر اس گھر میں (یعنی آنکھوں میں) نیند کا گذر کیونکر ہو سکتا ہے جبکہ دربانی کا فرض پتلی بڑے قاعدہ سے انجام دے رہی ہے۔ سب مبالغہ ہے لیکن شعر عالم بالا پر پہنچ گیا ہے ؎

کب نظر آوے گا یا رب وہ جوان سرو قد　　جس کے ابرو کے تصور نے کیا مجھ کو کماں

ابرو کے صرف تصور میں قد کا کمان کی طرح جھک جانا شاعرانہ غلو نہیں تو کیا ہے۔

اس چھوٹی سی بحر میں قیامت کی ٹھیل دیکھیے ؎

ہوئے اشکِ ولی ازبسکہ جاری اٹھا امواج دریا میں تلاطم

بات تو کوئی ایسی نہیں صرف اپنے رونے کا بیان ہے۔ آنسوؤں کی سرگذشت ہے لیکن مبالغہ کی صنعت کا ایک دلچسپ نمونہ ہے۔ ولی اتنا رویا کہ اس کے آنسوؤں نے دریا میں طوفان بپا کردیئے۔ تلاطم خیزیاں ہوگئیں۔

تری نیناں پہ گر آ ہو تصدق ہو تو اچرج نہیں کہ ان کو دیکھ کر گلشن میں نرگس نے ملی انکھیاں

چشم آہو سے آنکھوں کی تشبیہ ایک دہرائی ہوئی داستان ہے لیکن ہر بیان میں جدت پیدا کرنا انوکھی بات ہے۔

ہرن کا صدقے ہونا۔ نرگس کا آنکھیں ملنا کوئی تعجب خیز امر نہیں ہے۔ یہ سب حیران ہیں کہ ایسی بھی چیز دنیا میں پیدا ہوسکتی ہے جو قدرت کی کاریگری کا اختراع فائقہ (master piece) کہلائی جاسکے۔ کسی کا فارسی شعر ہے جو اسی قبیل سے ہے ؎

ہمہ آہوان صحرا سرِ خود نہادہ بر کف بامید اینکہ روزی بہ شکار خواہی آمد

ولی کے اس شعر میں تلمیح کی بندش لئے ہوئے مبالغہ کا ہنگامہ دیکھئے ؎

نہ کر تغافل اے مصرِ حسن کے یوسف مثال دیدۂ یعقوب ہیں نین تجھ بن

اس میں تشبیہ، تلمیح اور مبالغہ نے مل کر شعر کو مئے دو آتشہ بنا دیا ہے۔

انکھیاں سوں ہوا پیو جدا جب ستی میری جاتے ہیں مرے اشک گیا پیو جدھر سوں

اس شعر کی تشریح کسی کے اس شعر میں پڑھ لیجئے ؎

آنکھوں میں آکے کون الٰہی نکل گیا کس کی تلاش میں مرے اشکِ رواں چلے

یا پھر شاید اس کے مفہوم کی تلافی اس سے ہو سکے ؎

نظر آئے جہاں تک جانے والے کے قدم مجھ کو — وہیں تک میں نے پھیلا اپنا دامانِ نظر دیکھا

اب پھر ولی کے یہاں مبالغہ کا بیان سنیئے ؎

تجھ ہجر میں دامان و گریبان و رُمالاں — شاکی ہیں ہر اک رات مرے دیدۂ تر سوں

اس واقعہ کو کسی سے یوں سنیئے ؎

گریباں، آستیں، رومال سب اشکوں میں ڈوبے ہیں — یہ کس نے ان کے آگے جا کے میری داستاں کہہ دی

ولی نے اپنے رونے کا بیان لکھا ہے آرزو نے اپنی کیفیت سن کر جو سننے والے کا حال ہوا ہوگا اس کی تصویر کھینچی ہے۔ مبالغہ سہی لیکن شاید ہر وہ چیز جو دل پر ایک تعجب انگیز اثر پیدا کرتی ہے حقیقی ہے۔ اس میں بھی کتنا مبالغہ ہے ؎

تجھ مکھ کی جھلک دیکھ گئی جوت چندر سوں — تجھ مکھ پہ عرق دیکھ گئی آب گہر سوں

چاند کی چمک دھندلی ہو گئی جب اس نے تیرے رُخِ روشن کو دیکھا۔ موتی کے چہرہ کا آب و تاب جاتا رہا۔ تیرے چہرہ کی رونق دیکھ کر وہ ماند پڑھ گیا۔ موتی کی آب (جو اس کا واحد ذریعۂ قدر و قیمت ہے) کا چلا جانا اس کی ناقدری کا کیسا سانحہ ہے ؎

ہر گل کا بیتا چاک ہووے درد سوں میرے — گلشن کی طرف بھیجوں اگر آہِ سحری کوں

شاعر کہتا ہے اگر میں اپنے آہِ سحری کو گلشن کی طرف بھیج دوں تو اس آہ سے سب پھولوں کے سینے چاک ہو جائیں۔ میری آہ میں اتنا درد بھرا ہے۔ اور غالب کو کتنی ناامیدی ہے اس باب میں ؎

آہ کو چاہیئے اک عمر اثر ہونے تک　　کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

ولی　کرے فردوس استقبال اس کا　　تصور جو کرے تیری گلی کوں

اور غالب کا نظریہ ہے ؎

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی　　گھر ترا خلد میں گر یاد آیا

ولی　اس کے دہن تنگ کی تعریف کا نکتہ　　صنعت سوں ولی دیدۂ عنقا پہ لکھا ہوں

دہن و کمر کا سرے سے ناپید ہونا تو شاعرانہ مبالغہ ہی ٹھہرا عنقا ایک خیالی پرند ہے ولی دہن تنگ کی تعریف دیدۂ عنقا پر لکھتے ہیں۔ اس سعی لاحاصل کی داد دیجائے۔ یا تو دیدۂ عنقا پر دہن کی تعریف لکھ رہے تھے یا عطارد بھی گرد میں نہیں آتا ؎

طاقت نہیں کہ تیری ادا کا بیاں لکھے　　ہے گرچہ بے نظیر عطارد حساب میں

عطارد جو دبیر فلک کہلاتا ہے باوجود اپنی قابلیت کے تیری تعریف لکھنے سے قاصر ہے

ولی کا محبوب مبالغہ کی ہفت اقلیم کا بادشاہ ہے ؎

گلشن نہیں اس خلق کے وہ مکھ ہے تیرا اتنگ گل　　شبنم عرق جس سوں اٹھا افلاک کا تارا ہوا

کبھی یوں سراہتا ہے ؎

یو مکھ ہے ترا مورد انوار الٰہی　　نازل ہے ترے حسن پہ سب حق کی عنایت

اے آفتاب طلعت دل پر مرے نظر کر　　تا ایک پلک میں آدے تجھ پاس مثل شبنم

ولی کے اس شعر کا عقدہ غالب نے یوں حل کیا ہے ؎

پرتوِ خور سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم　　ہم بھی ہیں ایک عنایت کی نظر ہونے تک

تجھ زلف سوں لیا ہے کعبہ سیاہ پوشی — تیرے ذقن کے چہ میں پانی ہوا ہے آبِ زمزم

یا پھر یوں کہتے ہیں ؎

صنم کے لعل پر وقتِ تکلم — رگِ یاقوت ہے موجِ تبسم

جنتِ حسن میں کیا حق نے — حوض کوثر مقام تجھ لب کا

مرا دل چاندا اور تیری نگہ اعجاز کی انگلی — کہ جس کی ایک اشارت میں مجھے شق القمر دستا

اے غنچہ دہاں نام ترا جب سوں لیا ہے — اس آن سوں خوش باس ہوا ہے دہنِ گل

ہے ماہِ نو کے دل میں یہ آرزو ہمیشہ — اے شہسوار آکر تیری رکاب ہووے

ولی کی اس بھولی بھالی زبان کو ؎

آتشِ عشق نے بتوں کا کیا خانہ خراب — آگ دریا کو لگی اس کا بجھانا مشکل

خدائے سخن سے یوں سنیے ؎

عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب — کہ لگائے نہ لگے اور بجھائے نہ بجھے!

صنعت تضاد :۔ اس کو صنعت طباق بھی کہتے ہیں۔ اس کی تعریف یہ ہے کہ کلام میں دو لفظ ایسے لانا جو ایک دوسرے کی ضد ہوں جیسے ؎

اینکہ می بینم بہ بیداریست یا رب یا بخواب — خویشتن را در چنیں نعمت پس از چندیں عذاب

ناسخ۔ کچھ تری بات کو ثبات نہیں — ایک ہاں ہے تو پانچ سات نہیں

رواں دواں ہے سوئے نیستی مری ہستی — اجل کی گود میں مدت سے پل رہا ہوں میں

حالی شریعت کے جو ہم نے پیماں توڑے — وہ لیجا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

چمن میں نوچے ہیں صیاد نے پر — بہار گل ہے اور اپنی خزاں ہے

مومن بات اپنی وہاں نہ جمنے دی — اپنے نقشے جمائے لوگوں نے

غالب گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

میر ہونا جہاں کا اپنی آنکھوں میں ہے نہ ہونا — آتا نہیں نظر کچھ جاوے نظر جہاں تک

آتش واہ ری شانہ کی قسمت کس کو یہ معلوم تھا — پنجۂ شل سے کھلیں گے عقدہ ہائے مو دوست

ہم ہنسے سن کے نالہ بلبل کا — مجھ کو رونا ہے خندۂ گل کا

اقبال خزاں میں مجھ کو رلاتی ہے یاد فصل بہار — خوشی ہو عید کی کیونکر کہ سوگوار ہوں میں

تری جبین ابرو مرا غنچۂ دل — یہ عقدے ہیں وہ جن کو کھلتے نہ دیکھا

آزاد بن ترے سیر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ — خندۂ گل نے ہمیں خوب رلایا ہوتا

ولی سے اس صنعت کو سنئے

ہجر کی زندگی سوں موت بھلی — کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

دور نگی سوں تری اے سرو رعنا — کبھو راضی کبھو بیزار ہیں ہم

در وادی حقیقت جس نے قدم ہے رکھا — اول قدم ہے اس کا عشق مجاز کرنا

ظلمات میں یہ غم کے ملے گا تجھے آب خضر — دامن تلے ہے رات کے روز سفید پیدا

حاجت الیس کی کہنا ہو تو اُس سوں کہو ولی — محتاج جس کے سب ہیں قدیم و جدید پیدا

شتاب باغ میں آ اے گل بہشتی رو — کہ بلبلاں کوں جہنم ہوا چمن تجھ بن

ولی کے اس شعر کو

راہِ مضمون تازہ بند نہیں تا قیامت کھلا ہے بابِ سخن

غالب سے یوں سنیئے ؎

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

جلوہ پیرا ہو شاہد معنی جب زباں سوں اٹھے نقابِ سخن

یہ مار رونا کہ ہے تیری ہنسی آپ بس نہیں پربسی ہے پربسی

وہ صنم جب سوں بسا دیدۂ حیران میں آ آتش عشق پڑی عقل کے سامان میں آ

عقل اور عشق ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

آب ہوئے کیوں کہ دل اس سرو کا سخت ہے بے رحم ہے فولاد ہے

اگر اجل میں جل کر کنول خاک ہو نہ پہنچے ترے پاؤں کی خاک کوں

جل یعنی پانی اور خاک میں تضاد ہے۔ یہ عناصر ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

تجھ لب کی شیرنی سوں ہوئی دل کو بستگی تجھ زلف کی شکن نے مجھے دی شکستگی

بند ہونا اور ٹوٹنا ضد ہیں ایک دوسرے کی۔

دل جو تجھ زلف پیچ بند ہوا کون کھولے یہ عقدۂ لاحل

تجنیس نظم یا نثر میں ایسے دو لفظ لانا جو تلفظ، کتابت یا حرف تلفظ یا حرف کتابت میں یکساں ہوں اور معنی میں مختلف۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ تام اور ناقص۔

مثلاً نیل یعنی دریا اور رنگ

تجنیس تام جیسے زبان اور زمان۔ ہری، بری۔ یا مولانا حالی کے اس شعر میں ؎

ان کی گردن میں اگر قید کی رسی ہے پڑی
اپنی بے بال و پری کی بھی کہانی ہے بڑی

ناسخ
دم بلبلِ اسیر کا تن سے نکل گیا
جھونکا نسیم کا جو ہیں سن سے نکل گیا

کہا دل نے مری دیکھی جو وہ مانگ
کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ

ولی نے اس صنعت کو اس طرح استعمال کیا ہے ؎

گل مقصد کا ہار ڈالے ہیں
نقد ہستی جو ہار ڈالے ہیں

پہلے ہار کے معنی پھولوں کے ہار کے ہیں۔ اور دوسرے کے معنی ہارنے کے ہیں ؎

یک تل نہیں آرام ترے تل کے سبب مجھ
میں صورت تل دل کے سویدا پہ لکھا ہوں

دیکھا ہوں جب سوں خواب میں وہ چشم نیم خواب
صورت خیال و خواب ہوئی مجھ کوں خواب کی

گذر اس قامت کا ہوا ہے جب سوں مسجد میں
موذن کی زباں اوپر ہمیشہ لفظ قامت ہے

مجھے روز قیامت کا رہا نہیں خوف اے واعظ
خیال قامت رعنا مرے حق میں قیامت ہے

دل پہ ہے نوبت پریشانی
نین میرا دویم ہے یم کی قسم

شاعرانہ تعلی:۔ شاعرانہ اظہار فخر اردو شعرا کا عام وتیرہ رہا ہے۔ بہت سے تو مسلم الثبوت استادوں کو بھی نظر میں نہیں لاتے۔ اور بعض ایسے بھی ہیں جو اپنے درجے کو پہچانتے ہوئے مشاہیر کی عظمت کا بھی اعتراف کرتے ہیں۔ مثلاً مومن بالعموم سعدی کے نام پر ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ غالب کی تعلی دیکھئے ؎

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسداللہ خاں قیامت ہے

اب ولی اس صنعت کو اپنے کلام میں یوں رولتا ہے ؎

ولی تو بحرِ معنی کا ہے غواص ہر اک مصرع ترا موتی کی لڑ ہے
ہم پاس آکے بات نظیری کی مت کہو رکھتے نہیں نظیر اپس کی سخن میں ہم
یوں شعر تیرے اے ولی مشہور ہیں آفاق میں مشہور ہے جیوں کر سخن اس بلبل تبریز کا
عرفی و انوری و خاقانی مجھکوں دیتے ہیں سب حبابِ سخن
اپس کے سر پہ مارا کوہ کن نے تیشۂ غیرت ہوا جب خسرو عالم ولی شیریں زبانی سوں
تیرے سخن کے نغمۂ رنگیں کوں سن ولی ڈوبا عرق کے بیچ عراقی عراق میں
ترے اشعار ایسے نہیں فراقی کہ جس پر رشک آوے گا ولی کوں

یہ شاعری کا سنسار ہے، یہ شاعر کی دنیا ہے جس میں وہ سانس لیتا ہے اور بالآخر مر جاتا ہے بلکہ ایسے نقوش چھوڑ جاتا ہے جو مٹنے والے نہیں۔ کتابِ قدرت ایک تاریک کتاب ہے جس کے وراق پر سوائے شعراء کے کوئی روشنی نہیں ڈال سکتا۔

اصنام اور اشعار میں ما بہ الامتیاز یہ ہے کہ بت سکون اور اشعار جنبش کا اظہار کرتے ہیں۔ جب حسن سمٹ کر چپ چاپ کھڑا ہو جاتا ہے تو مجسمہ کہلاتا ہے اور جب حرکت اور رقص کرنے لگتا ہے تو یہی شعر ہو جاتا ہے۔ اجسام صنم سازی کا اور افعال شاعری کا موضوع ہیں۔ شعر کا تعلق وقت سے ہے اور تصویر کا تعلق فضا سے۔ تصویر ایک نگاہ میں اپنے مضمون کو ظاہر کر دیتی ہے شعر وقت کا طالب ہوتا ہے اور کلی کی طرح رفتہ رفتہ اپنے معنی کو ظاہر کرتا جاتا ہے۔ تصویر ایک

ثانیہ کی یادگار ہے۔ شعر ایک تتلی ہے جس کے پیچھے خیال بچہ کی طرح کہیں سے کہیں نکل جاتا ہے۔

شاعر یقینی ایک مصور ہے۔ صرف مصور میں اس میں فرق اتنا ہے کہ اول الذکر قلم سے مادی اشیاء کی تصویر کھینچتا ہے اور رنگ آمیزی کرتا ہے۔ لیکن شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیتا ہے۔

شاعری وہ فن ہے جس سے مقدمات موہومہ کی ترتیب دی جائے۔ اچھی چیز بدنما بری چیز خوشنما ثابت کی جائے۔ محبت اور غضب کی قوتیں مشتعل کر دی جائیں۔ کسی چیز کا بیان جب اس طرح کیا جائے کہ اصلی چیز آنکھوں کے سامنے آجائے تو اس پر شعر کی تعریف صادق آئیگی

شعر کا مقابلہ اگر ہے تو فلسفہ سے ہے۔ شعر میں اور نثر میں تقابل نہیں پایا جاتا۔ شاعر کے تخیل میں چیاں جنیں کو ذرا بھی دخل نہیں۔ اس کو کسی توجیہہ و تعلیل کی ضرورت نہیں۔ اور نثر لکھنے والے کو ایسی آزادی ہرگز نہیں ہے کہ اس میں توجیہہ و تعلیل کی گنجائش نہ ہو۔ نثر تو ایک غبارہ ہے کہ کتنا ہی اونچا ہو کشش ارض سے باہر نہیں ہو سکتا۔

شعر کے مضمون اگر نثر میں لکھیے اور شعر بھی غیر زبان کا ہو تو ساری نثر ہذیان سے مشابہ ہو جاتی ہے اب شاعری کے اس فلسفہ کو جوش ملیح آبادی کے تخیل سے ختم کیا جاتا ہے۔ شعر کی تعریف شعر ہی کے ذریعہ سنیئے ؎

شعر کیا ہے! نیم بیداری میں نہیا موج کا — پنکھڑی پر رات کو شبنم کے گرنے کی صدا
جوئے قدرت کی روانی دست مصنوعات میں — ٹوٹنا نگیں ستارے کا اندھیری رات میں
ہاتھ میں جھونکوں سے اک بجھتا ہوا ہندلا چراغ — جھلملانا دل کی شمعوں کا سر بزم دماغ

جلتے دیکھا ہے کبھی ہستی کے دل کا تونے داغ
جس کے پرتو سے غذا پاتا ہے شاعر کا دماغ

جام میں آتے ہی اڑ جاتی ہے یہ رنگیں شراب
ٹوٹ جاتے ہیں نفس کی زد پہ آکر یہ حباب

شعر ہو جاتا ہے صرف اک جنبشِ لب سے نڈھال
کاگ کے کھلتے ہی پڑ جاتا ہے اس ساغر میں بال

جن کے جاں پرور اثر سے دل ہیں سب پکڑے ہوئے
کھوکھلے نغمے ہیں وہ الفاظ میں جکڑے ہوئے

شاعری کا خانماں لفظوں کا ہے لوٹا ہوا
اس کا شیشہ ہے زباں کی ٹھیس سے ٹوٹا ہوا

گوہر نایاب جن نظموں کو کہتا ہے جہاں
وہ تو شاعر کے سمندر کی ہیں خالی سیپیاں

ادارۂ ادبیاتِ اردو

رفعت منزل۔ خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

حیدرآباد کا واحد علمی و ادبی ادارہ ہے جو اردو زبان کی پُرخلوص خدمت میں سرگرم ہے اس نے اب تک متعدد کتابیں شائع کیں۔ اور نوجوانوں میں اردو زبان اور ادب کی خدمت گذاری کا ولولہ پیدا کر دیا۔ بیسیوں ادیب اور شاعر اس میں سرگرم کار ہیں علم و فضل کے صحیح ذوق کی اشاعت اردو زبان کے استحکام اور اردو ادبیات کی وسعت کے لئے اس ادارہ نے جو غیر معمولی کام کیا ہے اس کا اعتراف ہر اہل ذوق کرتا ہے۔ اس ادارہ کی طرف سے اب تک حسبِ ذیل کتابیں شائع ہوئی ہیں

۱۔ **مرقع سخن** (جلد اول) حیدرآباد کے پچیس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ۔ چار سو سے زیادہ صفحات، پچاس سے زیادہ تصاویر۔ مجلد قیمت (صہ)

۲۔ **مرقع سخن** (جلد دوم) حیدرآباد کے دیگر پچاس شعرائے دورِ آصفیہ کا باتصویر تذکرہ چار سو سے زیادہ صفحات پچاس سے زیادہ تصاویر قیمت مجلد (صہ)

۳۔ **سراج سخن** حضرت شاہ سراج الدین سراج اورنگ آبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب۔ از پروفیسر عبدالقادر سروری ایم اے ال ال بی صفحہ ۱۵۲ قیمت ۱۲ر

۴۔ **ایمان سخن** استاد الشعرا شیر محمد خان ایمان حیدرآبادی کے حالاتِ زندگی کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب از مولوی سید محمد صاحب لکچرار اردو صفحہ ۱۲۰ قیمت ۱۲ر

۵۔ **فیض سخن** استاد کل حضرت میر شمس الدین محمد فیض علیہ الرحمۃ کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب۔ از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی ایچ ڈی صفحات ۱۴۴ قیمت ۱۲ر

۶۔ **بادۂ سخن** ڈاکٹر احمد حسین مائل کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب۔ از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام۔ اے پی ایچ۔ ڈی صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۲ر

۷۔ **کیف سخن** سید رضی الدین حسن کیفی کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا انتخاب از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زور ام اے پی۔ ایچ۔ ڈی صفحات ۱۲۲ قیمت ۱۲ر

۸۔ **متاع سخن** نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز کے حالات زندگی، کلام پر تبصرہ اور جملہ اصناف سخن کا بہترین انتخاب۔ از ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری ام۔ اے پی۔ ایچ ڈی صفحات ۱۲۵ قیمت ۱۲ر

۹۔ **ورڈز ورتھ اور اس کی شاعری** انگلستان کے مشہور شاعر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام جس نے اردو کی فطری شاعری کو خاص طور پر متاثر کیا۔ از مولوی میر حسن صاحب ام۔ اے صفحات ۱۸۴ قیمت عہ

۱۰۔ **ٹیگور اور اس کی شاعری** ہندوستان کے مشہور شاعر اعظم کے حالات زندگی اور تصنیفات پر تبصرہ از مولوی مخدوم محی الدین صاحب ام۔ اے صفحات ۱۲۸ قیمت عہ

۱۱۔ **ہوش کے ناخن** حیدرآباد کی سماجی زندگی کا ایک مرقعہ جو ڈرامہ کی شکل میں پیش کیا گیا ہے از مولوی میر حسن و مخدوم محی الدین صاحبان ام۔ اے صفحات ۹۶ قیمت ۱۲ر

۱۲۔ **یوسف ہندی قید فرنگ میں** مرزا غالب مرحوم کے واقعہ قید کا مستند تذکرہ از مولوی محسن بن شبیر رضا صاحب بی اے ال ال بی صفحات ۸۰ قیمت ۸ر

۱۳۔ **نقد سخن** کلام فانی کی سخنورانہ تنقید از نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز (زیر طبع)

المشتہر ——— خواجہ حمید الدین مہتمم ادارہ ———